سرسید کی بصیرت
علم الانسان ما لم یعلم
THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
اسرار عالم

سر سید کی بصیرت

اسرار عالم

DAR-AL-ILM
New Delhi

دار العلم، نئی دہلی

سرسید کی بصیرت

اسرار عالم

دارالعلم، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات۔۱۶

SIR SYED KI BASEERAT

By: ASRAR ALAM

نام کتاب	:	سرسید کی بصیرت
مصنف	:	اسرار عالم
طبع اول	:	جنوری ۲۰۱۳
طبع دوم	:	مارچ ۲۰۱۳
صفحات	:	۲۴۰
ناشر	:	دارالعلم، نئی دہلی
ہدیہ	:	₹ ۲۰۰/۔

Published By:

DAR-AL-ILM

New Delhi

فہرست

پیش لفظ

حامداً ومصلیاً!

نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بنی نوع انسان میں وہ آخری امت ہے جو منصب شہادت پر فائز کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کی کامیابی کا انحصار اب اسی گروہ پر ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی تک آتے آتے واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ یہ امت تاریخ انسانی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: عنقریب قومیں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوادیں گی۔ جیسے بھوکے (جانور) کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوادیتے ہیں۔ (ابوداؤد، بیہقی)

اس اندوہناک صورت حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ —— جو دنیا کی وہ واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کا کافی علم (ماکان وماھوکائن) دیا گیا —— آج حیران اور ناواقف راہ بھٹک رہی ہے۔ اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثار قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتار تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے گویا کوئی ہار ٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن وقول رسول کی روشنی میں امت کی صورت حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو صحیح زاویہ سے دیکھا جاتا اور آئندہ کے لئے خطوط کار کی نشاندہی کی جاتی تاکہ یہ امت اپنے فرض منصبی کو کماحقہ سرانجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔

چنانچہ انہیں امور کو پیش نظر رکھ کر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت بحث کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

انہ سمیع قریب مجیب

اسرار عالم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ یہ عاجز ''**سرسید کی بصیرت**'' امت کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

صورت حال کی نازکی بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ امت کی ذمہ داریاں بھی۔ صورت حال کی نازکی اس کی متقاضی ہے کہ اس کتاب کے محتویات سے امت کا ہر خاص و عام زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد واقف ہو جائے۔ لہٰذا امید ہے کہ قارئین اور بالخصوص اہل ہمم حسب استطاعت اسے عام کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

اسرار عالم

تمہید

ہندوستان، اس کے باشندگان بالعموم کروڑوں عوام جو مختلف نسلوں، مذاہب، زبانوں، تہذیبوں، ثقافتوں، جغرافیائی صورتوں (Features)، عادات اور طبائع سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف نسلی، علاقائی، لسانی، ثقافتی، تہذیبی اور جغرافیائی ناموں سے پکارے جاتے ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کا جو ان سب کے علی الرغم ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی صرف ایک ہی شناخت رکھتے ہیں اور اسی نام 'مسلمان' سے پکارے جاتے ہیں عاجز برسوں سے غائر مطالعہ کررہا تھا۔ ابتداءً عاجز کے پیش نظر موضوعات تھے: مسلمانوں کی مخصوص شناخت؛ ہندوستانی معاشرے میں ان کا منفرد توازن قائم کرنے والا کردار؛ ہندوستان جو ہزاروں سالوں سے چھوٹے چھوٹے جغرافیائی یا ثقافتی مگر باہم اجنبی خطوں کا مجموعہ تھا اسے تاریخ میں پہلی بار 'ہند' یا 'ہندوستان' کے نام سے سیاسی وحدت عطا کردینے کی مسلم روایت؛ اسی روایت کو مستحکم کرنے کے لئے ہند کے طول وعرض میں پہلی بار ایک 'عوامی قومی زبانِ رابطہ' (National Lingua Franca) 'اردو' کا ایجاد اور اسے مستحکم کرنے کے لئے مسلمانوں کا اپنے اپنے جغرافیائی اور علاقائی شناخت اور ان سے وابستہ بعض مفادات کی قربانی اور اس حوالے سے ان کا ایثار تا کہ سارا ہندوستان ایک مستحکم وحدت کی شکل اختیار کر لے۔ [اس مطالعے کا داعیہ غالباً دو کتابوں کے مطالعے سے ساٹھ کی دہائی میں پیدا ہوا پہلی: قرۃ العین حیدر کی کتاب 'آگ کا دریا' (1959) اور

دوسری پروفیسر محمد مجیب کی کتاب 'انڈین مسلمس' (1967)]۔ دورانِ مطالعہ ایک ھولناک تاریخی حقیقت ابھر کر سامنے آنے لگی۔ وہ ھولناک تاریخی حقیقت تھی گزشتہ تین سو سالوں سے ان کا مسلسل زوال و انحطاط اور اس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ چنانچہ اس ھولناک تاریخی حقیقت نے مطالعے کو مزید وسیع اور ازحد گہرا کر دیا۔ نئے حقائق (Facts & Data) کے سامنے آجانے کے بعد عاجز کے مطالعے کا دائرہ مزید وسیع اور متعدد الابعاد ہو گیا جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص زندگی کے جملہ شعبوں میں گزشتہ تین سو سالوں کے دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات وحادثات اور ان کے پس منظر، مضمرات اور عواقب کا دقیق جائزہ۔

۲۔ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش چیلنجیز (Challenges) اور ان کا جوابی عمل (Response)۔

۳۔ ان تین سو سالوں میں مسلمانوں کی زندگی کے جملہ میدانوں اور سطحوں پر زوال اور انحطاط کی نہ ختم ہونے والی صورتحال۔

۴۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے زوال وانحطاط کا بدترین سطح تک پہنچ جانا۔

۵۔ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران درپیش چیلنجوں (Challenges) پر مسلمانوں کے جوابی عمل (Response) کا غیر موثر (Ineffective)، خدنگِ جستہ (Misfire)، ناکافی (Inadequate)، اور بے محل (Misfit) ہونا لہذا ناکام (Unsuccessful) ہوجانا۔

۶۔ درپیش چیلنجوں، ان کی حقیقت، قوت اور وسعت سے متعلق مسلمانوں کے نادرست شعور، علم، ادراک اور فہم کے اسباب وعلل۔

۷۔ درپیش چیلنجوں پر مسلمانوں کی جانب سے جوابی عمل (Response) کی حقیقت، قوت اور وسعت کے نادرست شعور، علم، ادراک اور فہم کے اسباب وعلل۔

۸۔ کیا مسلمانوں کی جانب سے درپیش چیلنجوں پر جوابی عمل خلاف حقیقت (Unreal)، خلاف واقعیت (Fictitious)، غیر معقول (Irrational)، غیر انسانی (Inhuman)،

غیر اخلاقی (Unethical)، غیر اسلامی (UnIslamic)، خلاف سنت الٰہی (Anti-Sunnatullah)، اور خلاف رضائے الٰہی (Anti-Divine) تھے؟

۹۔ گزشتہ تین سوسالوں میں رونما ہونے والے حوادث کے پیچھے مشیت الٰہی کیا تھی؟

۱۰۔ گزشتہ تین سوسالوں میں رونما ہونے والے حوادث کے تعلق سے ارادۂ الٰہی کیا تھا؟

۱۱۔ گزشتہ تین سوسالوں میں رونما ہونے والے حوادث کے تعلق سے رضائے الٰہی کیا تھی؟

۱۲۔ گزشتہ تین سوسالوں سے مسلمانوں کی زندگی کے جملہ شعبوں میں انحدار مسلسل (Free Fall) کیا ان کے 'معتوب' ہوجانے کی علامت ہے؟

۱۳۔ گزشتہ تین سوسالوں سے مسلمانوں کی زندگی میں Free Fall کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات کا اظہار ہے کہ اب یہ قوم 'ولا یخاف عقبٰہا' (91:15) کے حدود میں داخل ہوگئی ہے؟

۱۴۔ کیا یہ قوم تاریخ کی سابقہ دیگر اقوام کی طرح خود کو 'اللہ کی محبوب و برگزیدہ قوم' سمجھنے کی ناقابلِ اصلاح خوش فہمی میں مبتلا ہوچکی ہے؟

۱۵۔ کیا سنت اللہ کے عین مطابق اب اس قوم کا تاریخی خاتمہ ایک یقینی امر ہے؟

۱۶۔ کیا سنت اللہ کے عین مطابق انھیں ذمہ داریوں کے ساتھ کوئی دوسرا انسانی گروہ برپا ہونے والا ہے؟ کیا بحیثیت امت مسلمہ محمدیہ کسی اور انسانی گروہ کی بعثت ہونے والی ہے؟

عاجز کے غائر مطالعے کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کا بنیادی سبب تکییف (Conditioning) ہے۔

۲۔ مسلم معاشرے میں اس تکییف (Conditioning) کو قائم کرنے والے 'حکمراں' اور 'علما' تھے۔

۳۔ مسلم معاشرے کو صدیوں تک اس تکییف (Conditioning) میں مقید رکھنے والے 'علما' تھے۔

۴۔ مسلم معاشرے کو صدیوں کی اس تکییف (Conditioning) اور اس کے نتیجے میں آئے زوال و انحطاط سے نکالنے کی واحد راہ 'ارتقائی نظامِ تعلیم' (Progressive Educational System) ہے۔

۵۔ 'ارتقائی نظامِ تعلیم' کی سب سے احسن تدبیر فی زمانہ 'سرسید کی بصیرت' (Vision of Sir Syed) میں مضمر ہے۔

۶۔ 'ارتقائی نظامِ تعلیم' یا سرسید کی بصیرت پر عمل آوری میں سب سے بڑی رکاوٹ 'علما' ہیں۔

1980 سے جاری اس مطالعے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب 'سرسید کی بصیرت' غور و فکر کا مرکز بن گئی۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس مطالعے کا رخ اس بصیرت کی عملی تعبیر یعنی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب مڑ جاتا۔ چنانچہ مطالعے کا اب مرکز المراکز مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بن گئی۔ یوں بھی متعدد وجوہ سے اس سے قبل بھی یہ یونیورسٹی غور و فکر کا مرکز المراکز تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی احوال، ان کی تاریخ اور مسلم نفسیات کی پیچیدگیوں کے ادراک کے لئے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر ہندوستان عالم کبیر (Macrocosmos) ہے تو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالم صغیر (Microcosmos)۔

چنانچہ عاجز کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ جا کر 'مادرِ علمی' مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے موجودہ احوال بچشمِ خود دیکھے اور 'سرسید کی بصیرت' اب تک کیا برگ و بار لائی ہے اس کا جائزہ لے۔

مشاہدات

۱۔ ''کیا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اپنا مقصدِ وجود (Raison d'etre) مکمل طور پر کھو چکی ہے؟''
آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جا کر ذہن میں آنے والا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ وہاں کی ذہنی، فکری، علمی، تعلیمی، تدریسی، تدریبی، اخلاقی اور معاشرتی صورت حال کا بچشم خود مشاہدہ کر کے ایک باخبر اور حساس انسان تاریخ کے ان ہولناک منظر ناموں میں کھو جاتا ہے جن کے نتیجے میں یہ عظیم الشان یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔ تاریخ کا ہر موڑ اور تاریخی شاہراہ کا ہر سنگ میل اس سے سوال کرتے ہیں: یہ یونیورسٹی کس پس منظر اور کن حالات میں قائم کی گئی تھی؟ اس کے بانی مبانی کے پیش نظر 'اصل خاکہ' کیا تھا؟ کیا سرسید کا قائم کردہ مدرستہ العلوم / اینگلو محمڈن اورینٹل کالج علی گڑھ (1875) جو 1920 میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام سے موسوم ہوا سرسید کے بعد فی الواقع انھیں خطوط اور بعینہ انھیں اصولوں پر پروان چڑھا جو اس کا 'اصل خاکہ' تھا؟ کیا وہ تعلیم گاہ اب بھی انھیں خطوط پر قائم ہے یا اب ان اصولوں اور مقاصد کا گورستان (Graveyard) بن کر رہ گیا ہے؟

۲۔ کیا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ امت میں اصلاح و تعمیر کرنے والوں کا کشت زار (Nursery) ہے یا مُنزمِن، ممراض، معطل، مفلوج اور ناکارہ لوگوں کا عیش گاہ؟

۳۔ کیا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ رفتہ رفتہ بے علم، بے ہنر، ناکارہ، بے حوصلہ، بے مقصد، بے عزم،

ژولیدہ فکر، ریاکار، خود غرض، ذہنی غلام، ہوس پرست، بے حس، بے غیرت، دریوزہ گر، زلہ ربا، کاسہ لیس، حاشیہ بردار اور اُلش نصیب طفیلیوں (Parasites) کا مسکن (Habitat) اور مامن (Safe Haven) بن کر رہ گئی ہے؟

۴۔ بالخصوص گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران مسلم یونیورسٹی کورٹ (Muslim University Court)، اکادمک کاؤنسل (Academic Council) اور ایکزیکیوٹیو کاؤنسل (Executive Council) کے علمی (Intellectual)، تعلیمی (Academic)، تدریسی (Pedagogical)، نصابی (Curricular)، تربیتی (Institutional)، معلمی (Educational)، ہدایتی (Instructional)، توسیعی (Developmental)، اور انتظامی (Executive) فیصلوں (Decisions) اور ہدایات (Rulings) کے بیشتر حصوں کو دیکھتے ہوئے قطعاً محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایسے ایوانوں اور ہیئتوں کے لئے گئے فیصلے ہیں جو صاحبان بصیرت (Visionaries) اور خلاّق (Innovative) یا کم از کم باخبر (Informed) لوگوں کی معمولی اکثریت پر بھی مشتمل ہوں۔

ہمہ دم متبدل ماحول کے باوجود ایک ایک فیصلے کا تجزیہ یہی باور کراتا ہے کہ فیصلے کرنے والوں کی اکثریت دماغی اور ذہنی طور پر Sterile، Visionless اور Mediocre افراد پر مشتمل ہوگی جن کے طبائع Moron اور Parasitic ہو چکے ہوں اور جن کی شخصیت میں ایسے رجحانات راسخ ہو چکے ہوں جنھوں نے انھیں مکمل طور پر Humpty Dumpty، Nincompoop، Poodle اور Uncle Tom بنادیا ہو۔

انسانی تاریخ گوناگوں احوال سے عبارت ہے۔ اس نے بدترین اور ہولناک مظالم میں مبتلا قوموں کو دیکھا ہے اور بدترین اور ہولناک مظالم کرنے والے نظاموں اور حکمرانوں کو بھی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ بدترین مظالم کرنے والے نظام اور حکمراں بھی بدترین و ہولناک ابتلا سے گزرنے والی قوموں میں پائے جانے والے صاحبان بصیرت (Visionaries) کی راہ روک دینے میں ناکام ہوگئے۔ الحمد للہ، بھارت میں مسلمان اب تک ایسی صورتحال سے کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ یہاں مسلمانوں کے احوال اب تک کبھی ایسے نہیں رہے جنھیں تاریخ میں 'برے احوال' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں بھارت میں مسلمانوں کے احوال مجموعی طور پر اتنے 'اچھے' اور 'موافق' رہے ہیں کہ درجنوں مسلم ملکوں کے عوام اس پر رشک کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

۵۔ وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں بھارت میں 'مسلم قیادت' کا رویہ عموماً منفی، سلبی اور نا قابلِ فہم رہا ہے۔ گزشتہ ساٹھ سالوں میں 'مسلم قیادت' کے ذریعہ برپا کی جانے والی تحریکیں اور ان کے نعرے مسلمانوں کی توجہ کے خاص مرکز رہے۔ ان تحریکوں میں بعض ہمہ گیر اور پرشور تھیں مثلاً 'اردو بچاؤ تحریک'، 'مسلم یونیورسٹی بچاؤ تحریک' اور 'مسلم پرسنل لا تحفظ تحریک' وغیرہ۔ لیکن بہ نظر غائر مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان تحریکوں کے پس منظر میں کوئی سنجیدگی تھی نہ مدبرانہ فکر۔ 'مسلم قیادت' کے ذریعہ چلائی جانے والی اکثر تحریکیں محض ردِ عمل (Reactionary) اور بالذات غرضی (Ad-hoc) تھیں۔ عام مسلمان ان تحریکوں اور ان کے نعروں کی حقیقت سے کم ہی واقف ہوئے۔ یہ تحریکات، ان کے نصب العین، ان کے طریقۂ کار، ان طریقوں کی عملیت، ان تحریکوں کے نعرے، ان کی کارکردگی اور ان کے برآمد ہونے والے نتائج، مضمرات اور عواقب کبھی زیر بحث لائے نہیں گئے بالخصوص انھیں برپا کرنے والی 'مسلم قیادت' کے ذریعہ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعرے قومی اور ملی نصب العین نہیں تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ 'نعرے' تھے ہی نہیں بلکہ ایسے جذباتی، دلکش اور عوامی 'Clitches' تھے جن کا مقصد عوام کے شعور کو بیدار کرنے کی بجائے ان کے جذبات کو برانگیختہ کرنا تھا۔ جذبات کو ابھارنا شعور کو مغلوب کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ممکن ہے خالی الذہن 'مسلم قیادت' کو ردِ عمل (Reaction) میں بالذات غرضی (Ad-hoc) یہی ترکیب سوجھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اصلی سبب ان کا مزاج (Temperament) ہو۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 661 عیسوی کے بعد 'مسلم قیادت' کو کبھی 'عوامی تحریک' چلانے کا تجربہ نہیں ہوا۔ 'مسلم قیادت' نے کبھی عوام کو مخاطب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ مسلم تاریخ میں پائی یا سمجھی جانے والی 'عوامی حرکات' (Public Mobilizations) کبھی بھی دو طرفہ (Two-way) اور بین الاقوامی (International) نہیں تھیں جو غیر مکیف (Unconditioned) ماحول میں واقع ہوئی ہوں۔ ایسی تمام 'عوامی حرکات' ہمیشہ یک طرفہ (One-way) اور خالصۃً قومی (Purely National) ہوئیں جو 'صد فی صد مکیف' (Strictly Conditioned) ماحول میں واقع ہوئیں۔

'اردو بچاؤ تحریک'، 'مسلم یونیورسٹی بچاؤ تحریک' اور 'مسلم پرسنل لا تحفظ تحریک' اور ان کے نعرے غیر معمولی جاذب اور جذباتی تھے۔ 'مسلم قیادت' نے شعوری طور پر ان تحریکوں کو برپا اور ان نعروں کو بلند کیا۔ ہر عمل کے پیچھے مقاصد ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے ان تحریکوں کو حقیقت اور ان نعروں کو نصب العین سمجھا۔ یہ غلطی سراسر عوام کی تھی۔ 'قیادت' کے نزدیک ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آج جب ان تحریکوں کو

برپا اور ان نعروں کو بلند ہوئے نصف صدی بیت چکی ہے یہ بات واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ 'قیادت' ان نعروں کے ذریعہ بظاہر دو مقاصد کا حصول چاہتی تھی:

۱۔ 'مسلم قیادت' کے Status quo کو برقرار رکھنا۔ اور

۲۔ اس 'قیادت' کے لئے مسلمانوں میں آئندہ قابلِ اعتماد متبعین (Followers) پیدا کرنا۔

ان دو مقاصد کے تناظر میں ان تمام تحریکوں میں سب سے دوررس نتائج کی حامل تحریک تھی 'مسلم یونیورسٹی بچاؤ تحریک'۔ 'مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ' مسلم تاریخ میں واقع ہونے والا ایک معجزہ تھی۔ چنانچہ گزشتہ نصف صدی میں اس تحریک کے ذریعہ اور اس کے جلو میں 'مسلم قیادت' نے قابلِ اعتماد متبعین پیدا کرنے میں صد فی صد کامیابی حاصل کر لی۔ آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 'مسلم قیادت' کے لئے قابل اعتماد متبعین پیدا کرنے والا زرخیز کشت زار (Nursery) بن گئی ہے۔

۶۔ بھارت میں گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران 'مسلم قیادت' کے ذریعہ بلند کئے جانے والے نعروں (Clitches) کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا 'انتہائی جاذب' (Extremely Attractive) ہونا ہے۔ عام طور پر یہ نعرے کم از کم چار ابعاد (Dimensions) کے حامل رہے ہیں:

۱۔ حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی حق تلفی

۲۔ اکثریتی فرقے کے مظالم اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی حق تلفی

۳۔ مسلمانوں کا مسلسل جانی و مالی استحصال (Extermination)

۴۔ مسلمانوں کا مسلسل ثقافتی اور تہذیبی استحصال (Extermination)

'مسلم قیادت' کے ذریعہ برپا کی گئی تحریکوں اور ان کے نعروں کے زیر اثر مسلمانوں کے ذہن و فکر میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ مسلمانوں کی پس ماندگی (Backwardness) اور استحصال (Extermination) میں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے زوال اور اردو کے خاتمے میں سرتا سر حکومت اور اکثریتی فرقے کا ہاتھ ہے۔ مسلمانوں کے مابین یہ امور کبھی سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث ہی نہیں آئے۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس پس ماندگی (Backwardness) اور استحصال (Extermination) کی اصل ذمہ دار 'مسلم قیادت' ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ بھارت جیسے جمہوری ملک میں مسلمانوں کے مسائل، ان کی پس ماندگی (Backwardness) اور استحصال

(Extermination) کو حکومت نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس کی بنیادی وجہ حکومت کی 'عدم توجہی' (Unattentiveness) نہیں بلکہ 'مسلم قیادت' کی 'غیر سنجیدگی' تھی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت محض اس لئے 'عدم توجہی' کا شکار اور اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں ناکام ہوگئی کہ اس نے 'مسلم قیادت' کو کبھی واضح (Clear)، سنجیدہ (Serious)، صاف (Unambigous)، اور قابلِ اعتماد (Faithful) نہیں پایا۔ حکومت کی کارکردگی (بہ حوالہ پلاننگ کمیشن اور تمام پنج سالہ منصوبے) یہ بتاتی ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں اس نے جس طبقے کی قیادت کو جتنا واضح، سنجیدہ، صاف اور قابلِ اعتماد پایا ہے اس کے مطالبات کو اسی قدر موثر طور پر پورا کیا۔

جہاں تک برادرانِ وطن بالخصوص اکثریتی فرقے کی بات ہے تو ان کے جس عمل کو 'تعصب' کا نام دیا جاتا ہے وہ دو احوال سے خالی نہیں۔ اولاً مسابقت (Competition) اور ثانیاً اخلاقی بدسلوکی (Immoral Treatment)۔ اوّل الذکر معاملات میں اسی فیصد واقعات اس اعتبار سے واقع ہوئے کہ مسلمانوں کی استعدادی پس ماندگی (Potential Backwardness) محرومی کا اصل سبب تھی جسے 'تعصب' کا نام دیا گیا۔

ثانی الذکر بلاشبہ ایک حقیقت اور قابلِ توجہ امر ہے۔ لیکن اس کی حقیقت قطعاً ایسی نہیں جیسی عموماً ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کو 'تعصب' کا نام دینا محض 'تعبیر' ہے۔ ایسا ہوتا ہے یہ ایک امر واقعہ ہے۔ لیکن اس کی حقیقت Circumstantial ہے۔ ایسی اخلاقی بدسلوکی (Immoral Treatment) محض اکثریتی فرقے کی نہیں بلکہ معاشرے میں موجود ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ اس کا تعلق معاشرے اور اخلاق سے ہے۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ اگر ایسی مبینہ اخلاقی بدسلوکی میں فریق ثانی اکثریتی فرقے سے متعلق فرد ہوا تو اسے بآسانی 'اکثریتی فرقے کا تعصب' سمجھا اور قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ایسی اخلاقی بدسلوکی کے سب سے زیادہ مرتکب خود مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ سنی، شیعی، مقلد، غیر مقلد، دیوبندی، بریلوی، مسلم پس منظر رکھنے والے ترقی پسند، کانگریسی، غیر کانگریسی، اشتراکی ہمہ دم آپس میں روزانہ اور بدترین طور پر ایسی اخلاقی بدسلوکی کرتے رہتے ہیں۔ اس اخلاقی بدسلوکی کا حال یہ ہے کہ باہم مسابقت میں اگر دو دیوبندی آمنے سامنے ہیں مثلاً ایک مغربی یوپی اور دوسرا بہار کا تو ایسا تعصب وہاں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس 'تعصب' کی انتہا یہ ہے کہ مثلاً اگر مسابقت میں دو ایسے دیوبندی ہیں جن میں دونوں دارالعلوم دیوبند کے فارغین ہیں تو پھر اس 'تعصب' کی بنا یہ ہوگی کہ کون کس

شیخ سے وابستہ ہے۔ کیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کا اس کی تاسیس سے بلا فصل اب تک ایک طبقے کے پاس ہونا اس 'تعصب' کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا پروفیسر محمد حسن مرحوم کی خوبیوں میں اس واقعے کا ذکر کہ جب جھارکھنڈ کی ایک یونیورسٹی میں لیکچرر کی ایک اسامی کے لئے انہوں نے متعدد ترقی پسند اور قربت رکھنے والے امیدواروں کو نظر انداز کر کے ایک مدرسہ سے فارغ عالم دین کو محض میرٹ کی بنیاد پر منتخب کرلیا، اس بات کا شاہد نہیں کہ ایسا 'تعصب' ہر طبقے میں عام ہے۔

[ملاحظہ فرمائیں: پروفیسر عبدالحق: جس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا: ایوان اردو، دہلی، جون ۲۰۱۰، صفحہ ۲۰]

۷۔ گزشتہ ساٹھ سالوں سے زاید عرصے سے 'مسلم قیادت' بالعموم مسلمانان ہند اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تناظر میں جن باتوں مثلاً:

۱۔ حکومتی حق تلفی،

۲۔ اکثریتی طبقے کا تعصب،

۳۔ مسلمانوں کا مسلسل جانی و مالی استیصال (Extermination)، اور

۴۔ مسلمانوں کا مسلسل ثقافتی و تہذیبی استیصال (Extermination)۔

کی بات کہتی رہی ہے اگر فی الواقع وہ حقیقت ہوتی جب بھی انسانی تاریخ میں ایسا ہونا کسی بابصیرت (Visionary)، پرعزم (Firm & Determined) اور بامقصد (Object Bound) قیادت کے زیر سایہ کسی قوم کے لئے ایک قلیل مدتی ظاہرہ (Short-term Phenomenon) سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ انسانی تاریخ خود اس بات کی شاہد ہے کہ 'معاشرت' ایک ہمہ دم متبدل ظاہرہ (Comprehensively Changing Phenomenon) ہے۔ اس کے تقریباً تمام عوامل (Factors) کیف و کم کے اعتبار سے متغیرات (Variables) واقع ہوئے ہیں۔ انسانی تاریخ میں حوادث (Events) نام ہے معاشرت کے ایک یا ایک سے زاید عوامل (Factors) کے ہمہ دم تبدیل ہو کر نئی صورتحال (New Circumstances)، نئی ترجیحات (New Priorities)، نئی جہات (New Dimensions)، نئے امکانات (New Possibilities) اور نئے مواقع (New Opportunities)، پیدا کرنے کا۔ کسی قوم کی بابصیرت (Visionary)، پرعزم (Firm &

(Determined)، صاف گو (Unambiguos) اور با مقصد (Object Bound) قیادت ان ہمہ دم متبدل احوال کا ماقبل ادراک کرتے ہوئے خلاقانہ تفکیر، تدبیر اور تعمیل کے ذریعہ قومی اہداف کے حاصل کرنے میں قوم کی سربراہی کرتی ہے۔ انسانی معاشرے میں تبدیلی لانے والے بنائی عوامل (Tectonic Factors) کو تین عنوانات کے تحت یکجا (Club) کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قوم کی حرکیت: یعنی قوم کے اندر پائی جانے والی احتسابی اور اصلاحی قوت کار اور ان کے گوناگوں مظاہر،

۲۔ دنیا میں جاری مشیئت: یعنی طبیعی قوانین (Physical Laws) اور ان کے مظاہر،

۳۔ دنیا میں جاری سنت اللہ: یعنی بنی نوع آدم میں جاری سنت اللہ اور ان کے مظاہر۔

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ ہمہ دم تبدیلی لانے والے بنائی عوامل (Tectonic Factors) کسی وقوعہ (Event) سے پیدا ہونے والی صورتحال (Circumstance) کو محض پچاس سالوں میں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی وقوعے (Event) کے سبب کسی قوم پر عارض ہوجانے والی بدترین صورتحال بھی پچاس سالوں سے زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتی الا یہ کہ خود اس قوم کے اندر تبدیلی لانے والے ان بنائی عوامل (Tectonic Factors) کے ذریعہ ڈالے جانے والے اثرات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نئی صورتحال (New Circumstances)، نئی ترجیحات (New Priorities)، نئی جہات (New Dimensions)، نئے امکانات (New Possibilities) اور نئے مواقع (New Opportunities) اور ان سے استفادہ کرنے والے داعیات کو بے اثر (Neutralise) کرنے والی قوت موثر طور پر کام نہ کر رہی ہو۔

بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بدترین حالات میں مبتلا قوم کے بعض طبقات کے اندر منفی (Negative) اور سلبی (Passive) رجحانات ارتجالاً یا اضطراراً ظہور پذیر ہوجاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہونے والا ایسا منفی اور سلبی رجحان دیر پا نہیں ہوتا۔ بابصیرت (Visionary)، پرعزم (Firm & Determined)، صاف گو (Unambigous) اور با مقصد (Object Bound) قیادت کے زیر سایہ بہت جلد مثبت (Positive)، ایجابی (Affirmative)، اقدامی (Assertive) اور تعمیری (Constructive) بلکہ عہد ساز (Historic) جوابی عمل (Response) ظہور پذیر ہونے لگتے

ہیں۔تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات میں بابصیرت (Visionary) اور خلاق (Innovative) قیادت کے ذریعہ کئے گئے اقدامات اکثر تاریخ ساز (Historic) ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ تین سو سال سے ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں جاری زوال وانحطاط اور ان میں فکری، علمی، سیاسی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور روحانی انحدار شدید (Free Fall) کی کیفیت انسانی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے بے نظیر واقعات (Unprecedented Events) ہیں۔انسانی تاریخ میں تبدیلی کے مذکورہ تین بنائی عوامل (Tectonic Factors) کی موجودگی میں ایسا ہونا از حد حیران کن اور نا قابل فہم ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. A.G. Noorani (ed): The Muslims of India: A Documentary Record; Oxford University Press; Fifth Impression: 2011

2. Basant & Shariff (ed): Handbook of Muslims in India: Empirical & Policy Perspectives; Oxford University Press: 2010

3. Gayer & Jaffrelot (ed): Muslims in Indian Cities: Trajectories of Marginalisation; HarperCollins Publishers India: 2012

4. Prof. Muhammad Mujeeb: The Indian Muslims: Last Two Chapters, George Allen & Unwin: London: 1967

انکشافات

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ گزشتہ ساٹھ سالوں سے مسلسل انحطاط کا شکار ہے۔ رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں آنے والا یہ انحطاط گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں انحدارِ شدید (Free Fall) کی صورت اختیار کر گیا۔ آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فکری، علمی، تعلیمی، تدریسی، تحقیقی اور اخلاقی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ہمہ گیر انحطاط کی عکاس ہے۔ یہ صورتحال اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ انحطاط مسلم معاشرے میں کس درجہ راسخ ہو چکا ہے۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جا کر بچشم خود مشاہدہ اور برسرِ زمین (On the Spot) جائزہ یہ بتاتے ہیں کہ وہاں موجود تمام بارہ فیکلٹیوں اور ان کے تحت قائم تقریباً سو شعبوں، اداروں اور مراکز میں مخلص، پیشہ ورانہ طور پر ذمہ دار اور جواب دہ، انتھک محنت کرنے والے، صاحب بصیرت، صاحب جودت، بے لوث، مستقبل آگاہ اور بیدار مغز اساتذہ اور برسرِکار اہلِ فن کی تعداد کتنی سرعت کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں ان کے اعصاب پر مسلسل نہایت برے اثرات مرتب ہونے کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ ایسے اشخاص اب برائے نام رہ گئے ہیں وہ بھی بے بس، مجبور، بے نوا، غیر موثر، محصور اور اچھوت (Untouchable)۔

۳۔ ان کے برخلاف گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں بے علم، غیر مخلص،

پیشہ ورانہ طور پر غیر ذمہ دار اور غیر جوابدہ، ناکارہ، بے بصیرت، خود غرض اور تھرڈ ریٹ اساتذہ کی تعداد تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ ظاہر ہے 'مسلم قیادت' کی ترجیحات، مسلم معاشرے کے بدلتے احوال، مسلم یونیورسٹی کورٹ، اکادمک کاؤنسل، ایکزیکیوٹو کاؤنسل اور سب سے بڑھ کر خود امیدواران کی اپنی طبع اس کی اصل ذمہ دار ہے۔ آج ایسے افراد یونیورسٹی سے باہر اور یونیورسٹی کے اندر تقریباً حاوی، بارسوخ، موثر اور ہمہ گیر ہو چکے ہیں۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں گزشتہ ساٹھ سالوں میں علم اور تحقیق کی تمام اساسیات (Fundamentals) منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔ علم (Knowledge)، معلومات (Informations)، حساسیت (Sensitivity)، مستقبل آگاہی (Prescience)، ادراک (Perception)، تحقیق (Research) اور تخلیق (Creativity) کی دنیا میں خیال (Idea)، فرضیہ (Hypothesis) اور نظریات (Theories) دینے، دانشی اختراق (Intellectual Break-through) کرنے، مرجع گروہ (Reference Group) اور حَکَم (Referee) بننے اور بنے رہنے کی Potential Ability مفقود ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساسی (Fundamental) شعبے اپنی حرارت غریزی کھو چکے ہیں۔ شعبۂ تاریخ، شعبۂ السنہ، شعبۂ لسانیات، شعبۂ دینیات، شعبۂ علوم اسلامیہ، شعبۂ طبیعات، شعبۂ کیمیا، شعبۂ حیاتیات، شعبۂ ریاضی، شعبۂ جغرافیہ، شعبۂ ارضیات وغیرہ کم و بیش علم اور تحقیق کے اعتبار سے بظاہر گورستان (Graveyard) میں بدل چکے ہیں۔ ان شعبوں میں ایسے مضامین اور اصناف کی تعلیم و تدریس جن سے فرد اور معاشرے میں Potential استعداد پیدا ہوتی ہے، مضامین اور اصناف کے ایسے گوشوں پر تحقیق اور تحقیقی صلاحیت پیدا کرنا جن سے ان مضامین میں فرد اور معاشرے کو تحقیقی تخصص حاصل ہوتا ہے، ان تخصصات کے ایسے افادے جن سے کسی فرد، یونیورسٹی اور معاشرے کا 'علمی تفوق' یقینی ہو جاتا ہے رفتہ رفتہ ختم کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔

مسلمانوں میں عام طور پر یہ بات پھیلی ہوئی اور تسلیم شدہ ہو گئی ہے کہ ان تباہیوں کی سراسر ذمہ داری حکومت کی 'عدم توجہی' اور اکثریتی فرقے کے 'تعصب' پر جاتی ہے۔ 'مسلم قیادت' اور ملت میں پھیلے ان کے اعضا، جوارح اور ذرائع ابلاغ نے امت کو عام طور پر یہی تاثر دیا ہے۔ بہ نظر غائر مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ اسے نادرست قرار دیتے ہیں۔ یہ سراسر خلاف واقعہ اور بے اصل بات ہے۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ خود حکومت اور اکثریتی فرقے نے اس بے اصل الزام کی کبھی موثر اور مدلل تردید

نہیں کی۔ بفرض محال اگر اس 'عدم توجہی' اور 'تعصب' کے الزام کو صد فی صد حقیقت و واقعہ بھی تسلیم کرلیا جائے جب بھی ایسے بدترین نتائج جو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ پر مرتب ہوئے اور اساسیات (Fundamentals) کی اس تباہی کا جو وہاں دیکھی جاسکتی ہے جواز ثابت نہیں ہوتا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اساسی شعبوں کی تباہی میں بنیادی ہاتھ خود 'مسلم قیادت' کا ہے۔

گزشتہ دوسو سالوں میں دنیا میں بعض قومیں ایسی 'عدم توجہی' اور 'تعصب' سے سوگنا بڑے مظالم کے باوجود محض اپنی بصیرت، عزم، دیانت داری، لگن اور قربانی سے اپنے اعلیٰ ترین مقاصد حاصل کر کے ترقی کے بام عروج پر پہنچ گئیں۔ کسی ظالم کا ظلم اور کسی معاند کی عدم توجہی ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکی۔

1848 اور بالخصوص 1872 سے 2000 عیسوی کی درمیانی مدت میں جس پیمانے کی قتل و غارت گری، انسانی گروہوں کی افراتفری میں ترکِ مکانی، جانی اور مالی تباہی اور افراد، خاندانوں، معاشروں، معاشرتی اداروں اور قوموں کی تباہی کا مشاہدہ اور تجربہ بالخصوص یوروپ نے کیا وہ بیسویں صدی میں برصغیر میں ہونے والے حوادث سے ہر اعتبار سے ہولناک تر نہ تھا؟ ان تمام قتل و غارت گری اور تباہی کے باوجود مغرب میں تعلیم، تحقیق اور تصنیف کے جملہ اساسی (Fundamental) شعبے اپنے سارے تخصصات کے ساتھ علی حالہ کام کرتے رہے۔ بالخصوص جنگ عظیم اول سے قبل اور اس کے بعد، جنگ عظیم دوم سے پہلے اور اس کے بعد، اقوام متحدہ اور سلامتی کاؤنسل کے قیام سے پہلے اور اس کے بعد حتی کہ انہدام سوویت یونین سے پہلے اور اس کے بعد۔ اساسیات پر یہ سارے تعلیمی، تحقیقی اور تصنیفی کام لندن، پیرس، برلن، موسکو، سینٹ پیٹرس برگ، ولنا، کراکاؤ، وارسا، برسیلاؤ، پراگ، بوڈاپسٹ، برن، وین، اسٹاک ہوم، اپسلا، کوپن ہیگن، اوسلو، میونخ (مائنش)، منسٹر (مائنسٹر)، بلگریڈ، ہمبرگ، لائبزش، ڈبلن، بخارسٹ، روم، نیویارک اور کیمبرج میسوچیسٹ کہیں ہو بلا فصل اور بلا عدم ارتباط جاری رہے اور آگے بڑھے جب کہ انہیں ایام میں وہاں ایسی ایسی انقلابی تبدیلیاں اور تاریخ ساز واردات ہوئیں جن سے ساری دنیا تہہ و بالا ہوگئی لیکن خود وہاں کی زندگی اور اس میں جاری علم، تحقیق اور تصنیف کے کاموں میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۵۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود فیکلٹیوں اور ان کے تحت قائم تقریباً سو شعبوں، اداروں اور مراکز میں موجود اور برسر کار اساتذہ اور تحقیقی موجہین (Research Guides) کی ذہنی، فکری، علمی، دماغی اور عقلی طبع میں درج ذیل امور غالب ہو چکے ہیں:

ا۔ کثیر انظباطی علمی اساس کا فقدان (Lack of Multi-Disciplinarian

Knowledge Base)۔

۲۔ امتیازی خصوصیت کا فقدان (Lack of Excellence)۔

۳۔ عدم خلاقیت بلکہ خلاقیت متوحش طبع (Uninnovativeness or rather Anti-Innovative Temperament)۔

۴۔ درسی کتب معلومات یعنی ثلثی، ثانوی اور اولین ماخذ سے براہ راست مستفاد معلومات کا فقدان

(Text-Book Based Knowledge i.e., Lack of Knowledge based on tertiary, secondary and primary source materials)

۵۔ کمترین کام چلاؤ درسی کتاب فہم (Minimal working Text-Book understanding)

۶۔ وجودیات، نشویات اور علمیات کے میدان میں بدسلیقہ تخفیف پسندی

(Uncouth Reductionism in the field of Ontology, Ontogenesis and Epistemology)

۷۔ بدترین لسانی استعداد کا حامل ہونا (Poorest of the poor Language Aptitude)

۸۔ بدترین لسانیاتی استعداد کا حامل ہونا (Poorest of the poor Linguistic Aptitude)

۶۔(الف) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اردو زبان کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر اردو زبان اس سے متعلق سارے علوم، ان علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی اور اردو زبان اور لسانیات کی تحقیق سے متعلق اعلیٰ ترین مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں شعبۂ اردو میں اتنی جامعیت یعنی سعت (Comprehensiveness)، عمق (Profoundeness)، انشعاب (Ramification)، دست رس (Outreach) اور کثیر انظباطیت (Multi-Disciplinarianism) ہونی چاہیے تھی جو اردو زبان ولسانیات کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرتی۔ ایسی جامعیت (Comprehensiveness) کا تقاضا تھا کہ شعبۂ اردو کے اساتذہ کم از کم چہار لسانی استعداد کے حامل ہوتے۔ چہار لسانی استعداد سے

مراد ہے چار زبانوں کی مطولات سے واقفیت جن کے لئے کم از کم فی کس چار زبانوں کی متوسطات یا مبادیات کالازمی علم۔ مثلاً ذیل کے خاکے سے ان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

اردو کے چہارلسانی استعداد کا خاکہ:

	مطولات	متوسطات ومبادیات
(۱)	اردو	:اپ بھرنش، پراکرت، پالی، اگی، ویدک سنسکرت، لوکک سنسکرت،
(۲)	فارسی	:چینی، منگولی، باستانی، آزنتی، اشکانی، پہلوی، ترکی،
(۳)	عربی	:عبرانی، نبطی، ارامی، سریانی، یونانی، کوئنی، بطریقی قبطی، ایتھوپیائی،
(۴)	انگریزی	:جرمن، فرنچ، اطالوی، اسپینی۔

انسانی تاریخ نے غلامانہ ذہنیت رکھنے والے افراد اور قوموں سے کبھی استعداد کا مطالبہ نہیں کیا۔ تاریخ صرف قائدانہ عزائم یا ذمہ داریاں رکھنے والے افراد اور قوموں سے استعداد کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور ایسا مطالبہ صرف اعلیٰ ترین استعداد کا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں برطانیہ کے رائل ہسٹاریکل سوسائٹی نے مشہور سیاح Vámbéry کو اپنے سفرِ مشرق [ملاحظہ فرمائیں: Armenius Vámbéry: Voyage d'un faux derviche en Asie Central, 1862-1864 (Paris, 1993)] کی روداد بیان کرنے کے لئے مدعو کیا تو سوال پیدا ہوا کہ Vámbéry جیسے قدیم وجدید سولہ زبانوں پر قدرتِ تامہ رکھنے والے ماہر زبان کے خطاب پر تبصرہ کرنے اور مجلس کی صدارت کرنے کے لئے کسے مدعو کیا جائے۔ چنانچہ برطانیہ کے اس وقت کی وزارت خارجہ کے سکریٹری کو اس مجلس کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا جو دنیا کی قدیم اور جدید اکیس زبانوں اور ان زبانوں میں موجود مواد پر غائرانہ نظر رکھتے تھے۔ عصر حاضر میں ہندوستان میں عام طور پر مسلمانوں کے مابین یہ شور سنائی دیتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس علمی استعداد کی کمی ہے اس لئے انھیں مواقع (Opportunities) میسر نہیں۔ اس کے برعکس تاریخ بالکل ہی مختلف بات کہتی ہے۔ مسلمان بے عزم ہیں اس لئے ان کے یہاں علمی استعداد پائی نہیں جاتی۔

(ب) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فارسی کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر فارسی زبان، اس سے متعلق جملہ علوم، ان علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی، فارسی زبان ولسانیات کی تحقیق سے متعلق ایران کے ہم پلہ اعلیٰ ترین مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند مثنی کا درجہ رکھتی ہے۔ فارسی کو تین ایسی

خصوصیات حاصل ہیں جو اس یونیورسٹی میں اس کی تعلیم، تحقیق اور تصنیف کو خصوصی اہمیت کی حامل بنا دیتی ہیں۔ یہ تین خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ فارسی قدیم، فارسی متوسط اور فارسی جدید کے اعتبار سے ہندوستان ایران کے بعد یا ایران کی ہم سری کرتا ہوا دوسرا گہوارہ (Cradle) ہے۔

۲۔ ڈھائی ہزار سالہ انسانی تاریخ میں عالمی کردار ادا کرنے والے دو سوپر پاورس میں سے ایک کی یہ رابطہ کی زبان (Lingua Franca) رہی ہے۔

۳۔ تین سو سالوں سے عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے عظیم ایشیائی شکار (The Great Asian Game) کی اولین زبان ہے۔

اس اعتبار سے یہاں شعبۂ فارسی میں اتنی جامعیت (Comprehensiveness) یعنی سعت (Amplitude)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)، دست رس (Outreach) اور کثیر انظباطیت (Multi-Disciplinarianism) ہونی چاہئے تھی جو فارسی زبان اور لسانیات کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرتی۔ ایسی جامعیت کا تقاضا تھا کہ شعبۂ فارسی کے اساتذہ کم از کم چہار لسانی استعداد کے حامل ہوتے۔ فارسی میں چہار لسانی استعداد یقیناً اپنی مخصوص توجیہات (Orientation) کی حامل ہوگی۔

(ج) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں انگریزی کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر انگریزی زبان، اس سے متعلق جملہ علوم، ان علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی، انگریزی زبان اور لسانیات کی تحقیق سے متعلق برطانیہ کے بعد بلکہ وسعت اور آبادی کے اعتبار سے برطانیہ سے وسیع تر، اعلیٰ ترین، مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند مثنیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ انگریزی کے حوالے سے پانچ ایسی خصوصیات ہیں جن کے سبب مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس کی تعلیم، تحقیق اور تصنیف خصوصی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ یہ پانچ خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد سلطنت برطانیہ کے ماتحت ساڑھے تین سو سالہ ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے انگریزی زبان کا مخزن ہونا۔

۲۔ گزشتہ ساڑھے تین سو سالوں کے دوران ساری دنیا میں پائے جانے والے بے شمار علوم اور ان کے ذخائر کا برطانیہ منتقل ہونا۔

۳۔ گزشتہ ساڑھے تین سو سالوں کے دوران ساری دنیا میں پائے جانے والے اسلام کے

80% علمی خزانوں اور اصل ماخذ کا برطانیہ منتقل ہونا۔

۴۔ عصر حاضر میں انگریزی کا عالمی ذریعۂ مخاطبت Lingua Franca ہونا۔

۵۔ گزشتہ ساڑھے تین سو سالوں میں جرمن زبان کے بعد سب سے زیادہ اسلامی اور مسلم لٹریچر کا تراجم، تحقیقات اور تصنیفات کی صورت میں انگریزی زبان میں پایا جانا۔

اس اعتبار سے یہاں شعبۂ انگریزی میں اتنی جامعیت (Comprehensiveness) یعنی سعت (Amplitude)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)، دست رس (Outreach) اور کثیر انظباطیت (Multi-Disciplinarianism) ہونی چاہئے تھی جو انگریزی زبان اور لسانیات کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرتی۔ ایسی جامعیت کا تقاضا تھا کہ شعبۂ انگریزی کے اساتذہ کم از کم چہار لسانی استعداد کے حامل ہوتے۔ انگریزی میں چہار لسانی استعداد بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے پس منظر میں اپنی مخصوص توجیہات (Orientation) کی حامل ہوگی۔

(د) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں سائنسی علوم کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر عصر حاضر میں مسلمانوں کے ذریعہ قائم کردہ سب سے پہلی اور سب سے بڑی یونیورسٹی ہے اس لئے جملہ سائنسی علوم، ان میں درک، گہرائی اور گیرائی اور سائنسی علوم میں تعلیم اور تحقیق کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ ترین مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ سائنسی علوم میں ایسی جامعیت کے لئے تین علوم میں جامعیت یعنی درک، گہرائی اور گیرائی ناگزیر ہوتی ہے۔ یہ تین علوم ہیں:

۱۔ فلسفۂ سائنس (Philosophy of Science)،

۲۔ تاریخ سائنس (History of Science) اور

۳۔ حقائق سائنس (Reality of Science)

مذکورہ ان تین علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی کے لئے تین قسم کے مآخذ کا یکجا اور یک جان ہونا لازمی ہے۔

۱۔ چہار لسانی ماحولیات: اس سے مراد ہے ویسا چہار لسانی ماحول جیسا اردو زبان کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ پنج تہذیبی پس منظر: اس سے مراد ہے مثلاً عراقی، مصری، یونانی، اسلامی، چینی / بھارتی تہذیبی پس منظر کا اولین مآخذ سے ادراک۔

۳۔ حقیقی سائنسی تحقیق کی تدریج: اس سے مراد ہے سائنس کی حقیقی تحقیق میں تدریج اور اس کا ادراک۔

جس یونیورسٹی اور اس کے ماحول میں چہار لسانی ماحولیات، پنج تہذیبی پس منظر اور حقیقی سائنسی تحقیق کی تدریج پائی نہیں جاتی ایسی یونیورسٹی سے اس بات کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ وہاں کے اساتذہ اور طلبہ سترھویں، اٹھارہویں، انیسویں، بیسویں اور اب اکیسویں صدی میں ظہور پذیر سائنس کی حقیقت سے کما حقہ واقف ہو سکتے ہیں۔

کیا —

(۱) نکلس کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus)(1473-1543) کے

(۱)Commentariolus(1510-1514) اور

(۲)De Revolutionibus Orbium Coelestium(1530)

(۲) ٹائکو براہے (Tycho Brahe)(1546-1601) کے

(۱)De nova Stella(1573)

(۳) سر آئزک نیوٹن (Sir Issac Newton)(1642-1727) کے

(۱)Philosophiae Naturalis Principia Mathematica(1687)

(۲)Two Notable Corruptions of Scriptures(1754)

(۳)De natura Acidorum(1710)

(۴)Optics(1704)

اور

(۴) البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein)(1879-1955) کے

(۱)

Uber der von molekularkinetischen Theorie der wärme gerförderte Bewegung von in ruhenden FlüssigKieten suspendierten Teilchen (1908)

(مولیکیولر کائنیٹک نظریہ حرارت کے مطابق ساکن سیال میں معلق چھوٹے پارٹیکل کی

حرکت پر مقالہ)

(۲)

Uber einen die Erzeurgung und verwandlung des Lichtes betraf fenden heuristischen Gesichtspunkt (1905)

(روشنی کی تخلیق اور تبدیلی سے متعلق استکشافی نقطۂ نظر پر مقالہ)

(۳)

Zur Elektrodynamik bewegter Körper (1905)

(حرکی اجسام کی الیکٹروڈائنامکس پر مقالہ)

(۴)

Ist die Tragheit eines Körpers von seinem Energieinhalt abhängig? (1905)

(کیا کسی جسم کا سکون (Enertia) اس کی توانائی مافیہ پر منحصر ہے؟)

(۵)

Die Grundlage der allegemeinen Relativitätstheorie (1916)

(نظریۂ اضافیت کی اساس)

(۶)

Can Quantum Mechanical Description of Physical Reality Be Considered Complete? (EPR Experiment) (1935)

(کیا فزیکل ریالیٹی کے کوانٹم میکینیکل بیان کو مکمل سمجھا جائے؟)

سے براہ راست واقف ہوئے بغیر کوئی جدید سائنس کو سمجھ سکتا ہے؟ یہی سبب ہے کہ جب عالم اسلام کے تین صف اول کے ماہرین سائنس سے عاجز نے چند سوالات کیے تو وہ جواب دینے سے عاجز رہے۔

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آج موجود بعض اساتذۂ سائنس کی مثال بعض معلومات، انکشافات اور تجربات کی روشنی میں تراویح میں ان حفاظ قرآن جیسی ہے جن کی قرأت میں صرف یعلمون اور تعلمون سمجھ میں آتے ہیں اور ایسے اساتذہ سے سائنسی علوم پڑھنے والے اکثر طلبہ کی مثال تراویح میں ان

مقتدیوں کی طرح ہے جو نیت باندھ لینے کے بعد اتنا غفیل ہو جاتے ہیں اور رکوع، سجدہ اور سلام کے سوا انھیں کچھ یاد نہیں رہتا۔

(ہ) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آرٹس، سوشل سائنس اور دیگر علوم کے اساتذہ:

جامعہ (University) سے کیا مراد ہے؟ اس کی حقیقت اور ضرورت کیا ہے؟ کسی انسانی اجتماعیت (Society) کو کب جامعہ (University) کی ضرورت پیش آتی ہے؟

University لاطینی لفظ Universitus سے مشتق ہے جس کا مفہوم ہے: کُل۔ جامعہ سے مراد ایسی تعلیم گاہ ہے جہاں تمام بشری علوم یکجا اور یکجان ہو جاتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بشر (انسانی معاشرہ) اور علوم (Oral+Written or Recorded) کے مابین ربط کی کیا نوعیت ہے؟

کیا یہ ربط منتخب (Selective) اور جزوی (Partial) ہے؟ یا باہم مربوط (Interconnected)، باہم متراکب (Intertwined) اور کُلی (Holistic) ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ بشر (انسانی معاشرہ) اور علوم کے مابین ربط کی نوعیت باہم مربوط (Interconnected)، باہم متراکب (Intertwined) اور کُلی (Holistic) ہی ہو سکتی ہے۔ منتخب اور جزوی قطعاً نہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے افراد اور قومیں بشر (انسانی معاشرہ) اور علوم کے مابین اس ربط کو منتخب (Selective) اور جزوی (Partial) دیکھتی یا دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ غلامانہ ذہنیت کا یہی رجحان تاریخ میں نظر آتا ہے۔ غلامانہ ذہنیت کے افراد اور قوموں کو کبھی جامعہ (University) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جامعہ (University) دنیا اور عالم انسانیت میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے خواہش مند افراد اور قوموں کی اولین ضرورت ہوتی ہے۔

جامعہ کسی مخصوص مقام پر کئی اسکولوں یا کالجوں کے یکجا ہو جانے یا کر دیئے جانے کو بھی نہیں کہتے۔ جامعہ کسی عمارتی مجمع (Complex) کا بھی نام نہیں۔ جامعہ وہ اعلیٰ ترین تعلیم گاہ ہے جہاں علمی قالب (Knowledge Matrix) کا وجود یقینی بنایا جاتا ہے۔ سارے علوم جہاں باہم مربوط ہو کر حقائق کا ادراک کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت کے افراد یا قوموں کو ایسے ادراک کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اس کے برخلاف قائدانہ کردار ادا کرنے کے خواہش مند افراد اور قوموں کے لئے یونیورسٹی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔

سرسید ہر چند کہ اپنی حیات میں جامعہ (University) دیکھ نہ پائے لیکن ان کے ذہن میں جو خاکہ تھا وہ ایک علمی قالب (Knowledge Matrix) کا خاکہ تھا جسے افسوس کہ سرسید کی وفات کے بعد نہ جنگ عظیم اول سے پہلے، نہ جنگ عظیم اول کے بعد، نہ جنگ عظیم دوم سے پہلے اور نہ ہی جنگ عظیم دوم کے بعد اب تک حقیقت کا جامہ پہنایا جاسکا۔

سرسید کے جانشین اور بالخصوص جنگ عظیم دوم کے بعد 'مسلم قیادت' سرسید کو اب تک سمجھ سکی اور نہ جامعہ (University) کی حقیقت کو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سرسید اور ان کے جانشینوں بالخصوص جنگ عظیم دوم کے بعد کی 'مسلم قیادت' کی ذہنی سطح کا فرق ہے۔ سرسید قائدانہ کردار کی ادائیگی کا تصور رکھتے تھے جب کہ ان کے بعد 'مسلم قیادت' غلامانہ ذہنیت کی حامل ہو چکی تھی۔ یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ 'بدترین ناموافق حالات' بھی کسی بابصیرت (Visionary)، پرعزم (Firm & Determined)، صاف گو (Unambigous) اور بامقصد (Object-Bound) قیادت کے زیر سایہ کسی قوم کے لئے ایک قلیل مدتی ظاہرہ (Short-term phenomenon) سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ انتہائی نامساعد اور ناموافق حالات میں بھی بابصیرت (Visionary) اور خلاق (Innovative) قیادت ایسے اقدامات کر لیتی ہے جو اس قوم کی تاریخ میں انقلابی تبدیلی لا کر نئی تاریخ رقم کر دیتے ہیں۔ عاجز کی ناقص رائے ہے کہ اگر تقسیم ملک کے بعد پیدا ہونے والے ناموافق اور نامساعد حالات میں بھی 'مسلم قیادت' نے بصیرت (Vision) اور خلاقیت (Innovativeness) کا ثبوت دیا ہوتا تو وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے حوالے سے ایسے فیصلے لینے میں کامیاب ہو جاتی جن سے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے نئے امکانات پیدا اور ترقی کے نئے ابواب کھل جاتے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ٹھیک اسی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ ناموافق حالات میں جینے والی قوموں نے بابصیرت (Visionary) اور خلاقانہ (Innovative) اقدامات کر کے اپنی تقدیر بدل ڈالی۔ اس موقع پر عاجز دو ماڈلس کی مثال پیش کرتا ہے:

۱۔ ناموافق ماحول میں غیر معمولی اہداف حاصل کرنے کا ماڈل:

۲۔ قلیل ترین انسانی اور مالی وسائل میں غیر معمولی اہداف اور منصوبوں کو پورا کرنے کا ماڈل:

پہلا ماڈل بیسویں صدی کی پچاس کی دہائی میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ویسلی لیونتیف (Wassily Leontief) نے پیش کیا جسے Inter-Industry Analysis یا Input-output

Analysis کہا جاتا ہے۔

اسی قسم کے ماڈل کا استعمال کر کے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو ناموافق حالات میں بھی قائدانہ کردار ادا کرنے والی مثالی اور عدیم النظیر یونیورسٹی میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. Wassily Leontief: The Structure of American Economy: 1951.

2. Princeton University Press: Input-output Analysis: An Appraisal: 1956.

دوسرا ماڈل بیسویں صدی کی چالیس کی دہائی میں جارج بی ڈینزگ (George B. Dantzig) نے پیش کیا جسے Linear Programming یا Mathematical Programming یا Activity Analysis کہا جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. Donald Stevenson Watson: Price Theory and Its Uses.

افسوس بے بصیرت اور غیر خلاق 'مسلم قیادت' نے سارے مواقع ضائع کر دیئے۔

آرٹس (Arts) اور سوشل سائنسز (Social Sciences) میں اساسی علوم دو ہیں۔ ان دو علوم اور ان کی جامعیت یعنی سعت (Amplitude)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)، دست رس (Outreach) اور کثیر انظباطیت (Multi-Disciplinarianism) میں مہارت تامہ کے بغیر قائدانہ کردار ادا کرنے والے کسی فرد اور قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ دو اساسی علوم ہیں:

۱۔ زبان (Language) اور

۲۔ تاریخ (History)

غلامانہ ذہنیت کی حامل قوم یا اس کی قیادت اکثر ان دو اساسی علوم سے کلی صرف نظر کر کے اپنی ساری توجہ یا توانائی ہنر (Technology) میں لگا دیتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ زبان (Language) اور تاریخ (History) کے بغیر ہنر (Technology) کا حصول افراد اور قوموں کو غلامی میں پختہ تر بنا دیتا ہے اور صدیوں کے لئے غلامی ایسے افراد اور قوموں کا مقدر بن جاتی ہے۔

ماضی قریب کا جائزہ بتاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 'مسلم قیادت' نے ان دو اساسی شعبوں یعنی زبان (Language) اور تاریخ (History) اور ان کی جامعیت (Comprehensiveness)

کا عملاً خاتمہ کر دیا۔ 'مسلم قیادت' کی بے بصیرتی (Visionlessness) کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا؟

۷۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اکثر اساتذہ کے حوالے سے خلاقیت (Innovation) اور تخلیقیت (Creativeness) کا ذکر از حد مضحکہ خیز (Ridiculous) ہے۔ اسّی فیصد اساتذہ بوزینی نقالی (Mimesis & Mimicry) پر بھی قادر نہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی اکثریت مغربی دنیا میں پائے جانے والے تیسرے درجے کے ماہرین فن کو بھی۔۔ جن کی باتیں عموماً ثلثی ماخذ اور مصادر (Tertiary Source Materials) پر مشتمل ہوتی ہیں۔۔ سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتی چہ جائے کہ مغرب میں پائے جانے والے ماہرین فن کو جن کی باتیں ثانوی اور اول درجے کے ماخذ و مصادر (Secondary or Primary Source Materials) پر مشتمل ہوتی ہیں۔ رہے مغرب میں پائے جانے والے ایسے ماہرین فن کو جن کی باتیں ماورائے اول درجہ (Ultra-Primary Sources) سے متعلق ہوتی ہیں تو یہ اساتذہ ان کے وجود سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ خواہ ان ماہرین کا تعلق شعبۂ سائنس سے ہو یا سوشل سائنس یا آرٹس سے۔ یہی سبب ہے کہ عالمی سطح پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مٹھی بھر اساتذہ کو چھوڑ کر بقیہ اساتذہ عموماً مغربی علوم کے حمالوں کی صف بندی میں تیسری صف کے آخر میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حالیہ زمانے میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اعلیٰ ترین اساتذہ کی باخبری یا بےخبری کا ایک واقعہ سامنے آیا:

ایک کتاب امریکہ میں 2011 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ماورائے اولین متن (Archetype Version) اور اولین متن (Prototype Version) پچھلے دس سالوں سے شائع ہوکر زیر بحث آرہے تھے۔ 2011 عیسوی میں اس کتاب کی باضابطہ اشاعت کے بعد بلا مبالغہ یوروپ، شمالی امریکہ اور آسٹریلیا کے علمی اور فکری حلقوں میں تہلکہ سا مچ گیا۔ سینکڑوں ماہرین فن نے اس پر تبصرے کئے یا اپنے مضامین اور خطبات میں اس کے حوالے دیئے۔ جب اس کتاب میں زیر بحث آئے ایک مسئلے پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اجل اساتذہ سے اظہارِ خیال کے لئے گزارش کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ کسی ایسی 'کتاب' سے سرے سے واقف ہی نہیں۔

۸۔ دنیا میدانِ عمل ہے۔ اس میدان میں ہمہ وقت افراد اور قوموں کے مابین مسابقت (Competiton) جاری ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ کوئی قوم راکب ہوجاتی ہے تو کوئی اس کا مرکب۔ لیکن انسانی تاریخ میں تضاد کبھی واقع نہیں ہوا۔ اس میدانِ عمل میں ہمیشہ وہی قوم راکب

ہوئی جو خلاق (Innovative) واقع ہوئی۔ جو قوم خلاق (Innovative) ہے اقدام (Initiative) کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے خواہ احوال اس قوم کے موافق (Favourable) ہوں یا ناموافق (Unfavourable)۔ خلاق (Innovative) قوم دوسری قوم کے چبائے ہوئے لقموں کو چباتی ہے نہ ماضی کے بہاؤ کا مجری بنتی ہے۔ وہ میدان عمل سے راہ فرار بھی اختیار نہیں کرتی۔ ایسی خلاق قوم اپنی خلاقیت اور اقدام سے نئی دنیا خلق کر کے نئی تاریخ رقم کرتی ہے۔

گزشتہ ساٹھ سالوں میں 'مسلم قیادت' کے زیر سرپرستی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کورٹ (AMU Court)، اکادمک کاؤنسل (Academic Council)، ایکزیکیوٹیو کاؤنسل (Executive Council) اور یونیورسٹی اساتذہ کے اکثر فیصلے، ان کی تعمیل اور ان کا مابعد احتساب (Accountability) خلاقیت (Innovation) سے کلیۃً عاری ہیں۔ ظاہر ہے کہ برسر زمین حقائق 'نظارۂ متخیلہ' نہیں بلکہ 'ٹھوس حقائق' ہوتے ہیں جو افراد اور اجتماعیات کو صرف نظر کرنے (Overlook) یا شترمرغ کی روش اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خلاقیت (Innovation) سے کلیۃً عاری 'مسلم قیادت'، یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اور بالخصوص اساتذہ پر عارض اسی 'جبر' نے انھیں تین باتوں کے لئے مہمیز کیا۔ یہ تین باتیں ہیں:

۱۔ 'مسلم قیادت' کا اپنے عدم خلاقیت کے نتیجے میں رونما ہونے والی ناکارکردگی اور ناکامی کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا (To rationalise the failure due to the uninnovativeness of the 'Muslim Leadership')۔

۲۔ 'مسلم قیادت' کا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا (To acquire self-contentment on the failure of their activities)۔

۳۔ 'مسلم قیادت' کی کھلی ناکامی / ناکارکردگی سے مسلمانوں کے لئے بذریعہ اخراج جذبہ تسکین کا سامان کرنا (To provide Catharisis for Muslims to escape the pangs of failure)۔

۴۔ 'مسلم قیادت' کا اپنے حقیقی ہدف تک رسائی کو یقینی بنانا (To ascertain the reach to the real target of the Muslim Leadership)۔

چنانچہ یہی وہ چار داعیئے تھے جنھوں نے 'مسلم قیادت' کو بیسویں صدی کی بالخصوص ساٹھ کی دہائی میں درج ذیل ترجیحات کے لئے ابھارا:

۱۔سرکاری ظلم، حق تلفی، بے اعتنائی اور مداخلت کا رونا ——رونا،
۲۔اکثریتی طبقے کے مظالم، تعصب اور معاندت کا رونا ——رونا —— اور
۳۔مسلمانوں کے لئے 'خصوصی مراعات' کے لئے پہلے ماورائے قانون ودستور اور بعد میں قانونی اور دستوری مطالبات کرنا۔ 'مسلم قیادت' اپنی مخصوص ذہنیت کے سبب ان ترجیحات اور مطالبات کے پسِ پردہ صرف 'انفرادی' اور طائفی (Sectional) 'خصوصی مراعات' جنھیں ذاتی اغراض کہنا زیادہ درست ہے چاہتی تھی۔ قوم کے تعلق سے ان کے پاس کوئی ٹھوس فکر اور منصوبہ بندی سرے سے تھی ہی نہیں۔ اس ذہنیت نے 'مسلم قیادت' کو پہلے بند کمروں میں اور بعد میں برسرِ عام چاپلوسی، کاسہ لیسی، دریوزہ گری، زلہ ربائی، کفش برداری اور اُلش نصیبی کی روش اختیار کرنے پر آمادہ کرلیا۔ اس طرح 'مسلم قیادت' کی معروف ہستیاں مثالی 'Uncle Tom' بن کر رہ گئیں۔ اس صورتحال اور روش نے مسلمانوں کی جملہ آبادی کو دوسروں کی نظر میں 'Waste' بنادیا۔ خود 'مسلم قیادت' حکومت کی نظر' میں بے وقعت' ہوگئی۔ چنانچہ پوری ملت بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بالخصوص جارج اورویل (George Orwell) کے اینی مل فارم (Animal Farm) میں بدل کر رہ گئیں۔

۹۔گزشتہ ساٹھ سالوں سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اکادمک کاؤنسل (Academic Council) کے تعلیم، تدریس اور نصاب سے متعلق بطور سینٹ (Senate) لئے گئے اکثر فیصلے مسلم یونیورسٹی میں انحطاط کا اصل باعث ہوئے۔ بے بصیرت (Visionless)، کورنگاہ (Blind)، مردہ ذوق (Senseless) اور غیر خلاق (Uninnovative) مجلسوں کے فیصلے اکثر اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر پروفیسر محمد شبیر خاں نے کیا ہے:

''اسی دوران میں ایک مرتبہ سائنس کے شعبہ جات کی فیکلٹی کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات کی کمیٹی کی صدارت کررہا تھا، تو اس میں ایک کیس ایسا آیا جس میں ایک شعبہ کے کسی ریسرچ اسکالر کے تحقیقی مقالہ کی ایک ملک کے باہر کے ممتحن نے بہت سخت الفاظ میں تنقید کی تھی۔ رپورٹ بہت لمبی تھی اور اس میں بہت سی غلطیوں کے متعلق بھی بیان کیا گیا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کس طرح ان تمام چیزوں کی تصحیح کی جاسکتی ہے۔ باہر کے ملک کے پروفیسر نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے کئی ریسرچ اسکالرس کے کئی تھیسس دیکھ چکا ہوں جن کا معیار بہت ہی بلند ہوتا تھا اور اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تحقیق کا معیار اتنا

کیسے گرگیا۔ میری رائے یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو خاص طور پر تحقیق کرنی چاہیئے کہ تحقیق کے معیار کے اتنا گرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ مزید یہ لکھا تھا کہ میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس تھیسس کے بارے میں میں نے جو بہت سی رائیں دی ہیں، ان کی روشنی میں دوبارہ درست کیا جائے۔ اور اس کے بعد چونکہ میں کافی وقت تک بہت مشغول رہوں گا اور اس تھیسس کو دوبارہ جلدی نہ دیکھ سکوں گا اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اس مقالہ کو درست کرنے کے بعد ہندوستان کے جو دوسرے ممتحن ہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ جب اس کی ساری غلطیاں درست ہو جائیں تو ریسرچ اسکالر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی جائے۔ قارئین میں سے جو لوگ یہاں کے حالات سے واقف نہ ہوں ان کو میں یہ بتادوں کہ اس قسم کی کمیٹی میں پوری فیکلٹی کے تمام شعبہ جات کے صدر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ فیکلٹی کے متعدد ایسے اشخاص، جن کو تحقیقات کے کاموں میں نمایاں سمجھا جاتا ہے کمیٹی میں الیکشن کر کے بھیجا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کا وائس چانسلر یا ان کی عدم موجودگی میں پرووائس چانسلر صدر ہوتا ہے۔ چنانچہ کمیٹی کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے اور اس لئے اس کی سفارش کبھی آگے چل کے کسی بھی جگہ رد نہیں کی جاتی۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب اس رپورٹ کے سن لینے کے بعد سائنس کے ہر شعبہ کے صدر، ڈین اور دوسرے نمائندے سب لوگوں نے سفارش کی کہ ریسرچ اسکالر کو فوراً ڈگری دے دی جائے اور ان تمام لغویات میں زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے کہ وہ تمام غلطیاں اور کمزوریاں دور کرتا پھرے۔ اس لئے کہ ملک کے باہر کے ممتحن نے یہ تھوڑے ہی لکھا ہے کہ اس مقالہ کو اس کی نمایاں غلطیاں درست کرنے کے بعد میرے پاس بھی دوسری بار دیکھنے کو بھیجا جائے۔ اور جہاں تک ہندوستان کے دو ممتحنوں کا ذکر ہے تو وہ تو ڈگری دینے کی سفارش پہلے ہی کر چکے ہیں۔ یہ بات آپ لوگوں کے ملحوظ خاطر رہے کہ ہندوستان کے جو دو ممتحن ہوتے ہیں ان میں سے ایک تو شعبہ ہی کا ہوتا ہے جس کی نگرانی میں تھیسس لکھا جاتا ہے۔ میں نے حاضرین جلسہ سے بہت معذرت کے ساتھ درخواست کی کہ ہر چند کہ میں اس وقت اس میٹنگ کی صدارت کر رہا ہوں لیکن آپ لوگوں کی طرح میں بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک استاد ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ یونیورسٹی کے قوانین میں لکھا ہے کہ جب تک ڈگری دینے کی تینوں ممتحن سفارش نہ کریں اس وقت تک ڈگری نہیں دی جاسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا آپ لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ غیر ملک کے ممتحن نے جو پہلے بھی اس یونیورسٹی کے ایسے کاموں سے متعلق رہ چکا ہے اور جس نے یہاں کے پہلے کے مقالات کی بہت تعریف بھی کی ہے۔ اس مقالے کی کڑی تنقید

کرتے ہوئے بہت سی تجویزیں کیوں پیش کیں اور یہ کیوں لکھا کہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو اس بات کی تحقیق خاص طور سے کرنا چاہیئے کہ مسلم یونیورسٹی میں تحقیق کا معیار اتنا زیادہ کیوں گر گیا ہے۔ میری ان باتوں کو سننے کے بعد بھی سائنس کے کسی صدر شعبہ، دوسرے نمائندہ اور ڈین نے میری بات نہ مانی اور اپنی ضد پر اڑے رہے کہ اس سے ریسرچ اسکالر کے وقت ضائع کرنے کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس پر آخر میں میں نے انتہائی صفائی سے کہہ دیا کہ آپ لوگ برا مانیں یا اچھا لیکن کم از کم میں اپنی صدارت میں اس طرح ریسرچ اسکالر کو ڈگری نہیں تجویز کر سکتا۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور اس کے کیا حالات ہیں۔ لیکن جو کوئی بھی ہو اور اس کے جو حالات بھی ہوں۔ میں اپنی یونیورسٹی کے معیار کے اس طرح گرتے رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اور کم از کم میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ جب وائس چانسلر صاحب کی موجودگی میں یا آپ کے مستقل پرو وائس چانسلر کی موجودگی میں یہ میٹنگ ہو اس وقت آپ جو چاہیں منظور کروالیں۔ عارضی طور پر دو ماہ پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے میں نے کام کیا۔ میرے بعد اس کیس کا کیا حال ہوا مجھے اس کا علم نہیں۔ اس لئے کہ میں جس راستہ پر نہیں چلتا اس کے میل نہیں گنتا''۔

ملاحظہ فرمائیں

پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: صفحہ 116-115: خدا بخش لائبریری جرنل:50: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1989۔

۱۰۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں قائم ایکزیکیوٹیو کاؤنسل (Executive Council) نہایت اہم مجلس ہے۔ بدقسمتی سے اس مجلس کو جس قدر پیشہ ورانہ اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی روح سے وابستہ ہونا چاہیئے تھا یہ اسی قدر غیر پیشہ ورانہ اور روح سے عدم وابستہ واقع ہوئی ہے۔ یہ وہ اہم مجلس ہے جسے ہر لمحے اور ہر قدم پر تدبیری اجتہاد کا سامنا ہوتا ہے اور اس کی پیشہ ورانہ مہارت اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی روح سے وابستگی جیسے دو زادِ راہ کے سوا اس کے پاس کوئی قوتِ کار میسر نہیں۔ اس کی قوتِ کار اور اس کا دائرۂ کار دونوں محدود ہیں لیکن اس کے سامنے چیلنجز اس کے برخلاف لامحدود ہیں۔ اس صورت حال میں ہر لمحے یہ مجلس تدبیری اجتہاد کی سان پر چڑھی ہوتی ہے۔

بایں ہمہ یونیورسٹی کی ایکزیکیوٹیو کاؤنسل (Executive Council) کی حقیقی صورتحال کیا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

''دوسرا واقعہ جس کا مجھے صدمہ ہوا یہ تھا کہ میڈیکل کالج کے ایک صاحب جو اپنے مضمون میں جید

عالم سمجھے جاتے تھے اور یقیناً ہوں گے بھی ایک مرتبہ ایکزیکیوٹیو کاؤنسل کے الیکشن کے سلسلہ میں ایک صاحب کو ووٹ دینے کی سفارش کرنے میرے یہاں تشریف لائے۔ میں اور میری بیوی ان کے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ میری بیوی نے ان کی خاطر مدارات کے لئے خاص طور سے چائے اور دوسری چیزوں کا انتظام کیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ اپنے مضمون کے بہترین استادوں میں سے ہیں، پڑھے لکھے اور کام کرنے والے ہیں اور ایسے آدمی کے لئے ووٹ مانگنے آئے ہیں جن کو پڑھنے لکھنے اور اپنے کام کرنے میں نہ کوئی دلچسپی ہے نہ تعلق۔ تو وہ ایکزیکیوٹیو کاؤنسل جو قریب قریب ہر معاملہ کے لئے بہترین کاؤنسل سمجھی جاتی ہے وہاں جاکر کیا کریں گے۔ کہنے لگے جب میں انگلستان گیا تھا تو میں نے وہاں بہت اچھا کام کیا تھا۔ لیکن یہاں استاد ہونے کے بعد جب میں نے حالات دیکھے تو یقین ہوگیا کہ مسلم یونیورسٹی میں ہر کام پالٹکس سے ہوتا ہے۔ اب تو مجھے پالٹکس لڑنے اور لڑانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اور پڑھنا لکھنا تو اب صرف برائے نام ہے۔ اس کام کو میں نے بالکل چھوڑ دیا۔ جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کے سود پر معاملہ چل رہا ہے۔ میں نے بہت تکلیف سے ان سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بات آپ کے لئے زیب نہیں دیتی اس لئے کہ استاد کا فرض تو یہ ہے کہ ہمیشہ تعلیمی کام میں مشغول رہے۔ بولے مسلم یونیورسٹی میں تو کام کرنے والے استادوں کی مٹی پلید ہوجاتی ہے۔ اس لئے اس سے کیا فائدہ۔ میں یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ اور ذاکر صاحب کی بات دل پر تازہ ہوگئی"۔

ملاحظہ فرمائیں:

پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: صفحہ 117-116: خدابخش لائبریری جرنل: 50: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1989۔

۱۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں قائم وہ مجلس جسے اس کی روح اور جسد کی سب سے بڑی محافظ ہونا چاہیۓ تھی وہی اس کی تباہی کا سب سے بڑا سبب بن رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو فکری، علمی، ذہنی، اخلاقی زوال اور انحطاط کے قعر مذلت میں دھکیل دینے میں بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی مجلس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی یہ باوقار مجلس 'یونیورسٹی کورٹ' (University Court) ہے جو دراصل ہندوستان میں 'مسلم قیادت' کی 'نمائندہ ایک چھوٹی مجلس' ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں قائم یہ وہ 'عاملہ' ہے جس کے ذریعہ رفتہ رفتہ 'قیادت' نے اپنی ساری ذہنی، فکری، علمی، عملی اور اخلاقی کثافتوں اور آلودگیوں کو بالآخر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں Landfill کے بطور استعمال کرکے اس کے ماحول کو آلودہ (Contaminated) کرکے رکھ دیا۔

زہریلا دائرہ

ا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ریکارڈس، روایات، باخبر افراد کے ملفوظات اور بالمشافہ گفتگو اور ان کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ گزشتہ کئی دہوں سے یونیورسٹی میں 'استاذ' مقرر ہونے کے لئے حقیقی علمی استعداد' 'مطلوبہ لازمی استعداد' نہیں رہی۔ 'کاغذی سند مطلوبہ لازمی استعداد' اور 'رسوخ' (Approach) 'ترجیحی استعداد (Ability of Preference) قرار پائے۔ اس طرح 'رسوخ' (Approach) کو یقینی اور موثر (Actual & Effective) بنانے والی دو چیزیں سامنے آگئیں: اولاً: 'مفادات' (Interests) اور ثانیاً: 'عصبیت' (Prejudice)۔ چنانچہ امیدواران کے لئے حقیقی اور فنی علمی اور عملی یا تجرباتی استعداد عملاً بے معنی بن کر رہ گئیں۔ گزشتہ بیس پچیس سالوں میں صورتحال مزید تحلیل ہو کر ابتر ہو گئی۔ اب لیکچرر کے ریڈر اور ان کے پروفیسر ہونے کی بنیاد 'مدت کار' قرار پا گئی چنانچہ کسی کا اب پروفیسر ہونا صرف اس بات کو ظاہر کرنے لگا کہ وہ کتنا 'مزمن، سن رسیدہ بلکہ 'گرگ باراں دیدہ' ہے۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا ایک حالیہ سروے (2010) درج ذیل باتوں کو درست ثابت کرتا ہے:

ا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فی الوقت موجود پروفیسروں کی 50 فیصد تعداد ایسی علمی استعداد رکھنے والوں پر مشتمل ہو چکی ہے جو مثلاً ڈی پی ایس (Delhi Public School) کے

دسویں درجے کے دس فائق (Top-Tens) کو پڑھانے، ان کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے اور ان کے علمی افق کو وسیع کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

۲۔ یا بالفاظ دیگر فی الوقت موجود پروفیسروں کی 70 فیصد تعداد ایسی علمی استعداد رکھنے والوں پر مشتمل ہو چکی ہے جو مثلاً بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی کے Höhere Schule اور فرانس کے Lycée کی آخری جماعت کے دس فائق (Top-Tens) کے ذریعہ پڑھائے گئے اسباق کو سمجھ کر ان کی تکرار (Repetation) کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

۳۔ یونیورسٹی میں فی الوقت موجود لیکچررز کی 50 فیصد تعداد ایسی علمی استعداد اور علمی افق رکھنے والوں پر مشتمل ہو چکی ہے جو ساٹھ سال قبل اسی بھارت کے طول وعرض میں پائے جانے والے مڈل اسکول کے 'منتخب اساتذہ' کی علمی استعداد اور ان میں پائے جانے والے علمی افق کے برابر بھی نہیں۔

اس مقام پر عاجز اپنے دو اساتذۂ کرام کا ذکر بطور 'تقریب فہم' کرتا ہے۔ ساٹھ سال قبل کا یہ منظر نامہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہی نہیں بلکہ پوری ملت کے زوال وانحطاط کی درست تفہیم کے لئے بھی معاون ہوگا:

ا۔ مولانا محمد رفیق: چھوٹا سا قصبہ، مولانا معلم، امام اور خطیبِ مسجد، چالیس روپے ماہانہ کفافِ نفس، قصبے کے تیس خاندانوں سے ایک ایک دن صبح کا ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا۔ عاجز کے قرآن، فارسی اور عربی کے اولین استاذ۔ سبع معلقات، حماسہ ابوتمام، شاہنامہ فردوسی، مثنوی معنوی، خمسۂ نظامی گنجوی کے ہزاروں اشعار گویا ازبر۔ رودکی سے قاآنی تک کے سیکڑوں اشعار نوکِ زباں۔ والدِ محترم کے قول کے مطابق منطق اور فلسفہ میں طاق۔

۲۔ مولوی بدرالدین: قصبے سے ایک میل کے فاصلے پر واقع مڈل اسکول میں انگریزی، فارسی اور اردو کے استاذ۔ عاجز انگریزی، فارسی اور اردو میں اپنے ہم سبق رفقا سے ہر اعتبار سے فائق۔ ایک دن عاجز نے عرض کیا: میں انگریزی میں اعلیٰ استعداد پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ پل بھر عاجز کے چہرے پر نظر ڈالی پھر حکم فرمایا: کاپی لے کر آیئے۔ میں نے کاپی پیش کی۔

انہوں نے چند الفاظ لکھے اور فرمایا: انھیں یاد کر کے کل سنائیے۔ عاجز نے کاپی پر نظر ڈالی، کچھ نامانوس سے الفاظ لکھے تھے۔ میں نے دریافت کیا تو فرمایا: یہ لاطینی ہے۔ انگریزی میں اعلیٰ استعداد کے لئے لازمی۔ انھیں یاد کر کے کل سنائیے۔ اللہ ان دونوں پر رحمتیں نازل کرے۔

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

۳۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں قائم بارہ فیکلٹیوں کے سو سے زاید شعبوں، اداروں اور مراکز کے اساتذہ اور ماہرین کی موجودہ تحریری اور تصنیفی صورتحال نے Potential اور Actual استعداد کے تعلق سے ایسے سوال کھڑے کر دیئے ہیں جو حد درجہ تشویشناک معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں ذیل میں یوں ملخص کیا جاسکتا ہے:

ا۔ اساتذہ کی 50 فیصد موجودہ تعداد تحریری اور تصنیفی میدان میں عالمی معیار (World Standard) کے مطابق Potential استعداد کی سرے سے حامل ہی نہیں۔

۲۔ اساتذہ کی 80 فیصد موجودہ تعداد تحریری اور تصنیفی میدان میں عالمی معیار (World Standard) کے مطابق Actual استعداد کی حامل نہیں۔

۳۔ اساتذہ کی 10 فیصد موجودہ تعداد کی تحریری اور تصنیفی کاوشیں دوسرے یا تیسرے درجے کی یا کسی دوسرے یا تیسرے درجے کے ماخذ سے مستفاد ہوتی ہیں اگرچہ انھیں علانیہ 'سرقہ' (Plagiarism) کہنا مشکل ہے۔

۴۔ اساتذہ کی 10 فیصد تعداد محض برائے ضرورت یا اضطراراً (Under Compulsion) تحریری اور تصنیفی کاوشیں کرتی ہے وہ بھی اکثر Cut & Paste یا 'کھلا سرقہ' (Stark Plagiarism) ہوتی ہیں۔

۵۔ اساتذہ کی 1 فیصد موجودہ تعداد ایسے مصنفین پر بھی مشتمل ہے جو ہر چند کہ معمولی علمی و تحقیقی استعداد کی حامل ہے لیکن محض ہنرمندی سے ایسی تصنیفات اور تحقیقی کاوشیں کرتی نظر آتی ہے جن پر لوگ (؟) حیران رہ جاتے ہیں۔ ایسے مصنفین تین مرحلوں میں ان تحریروں کو

تیار کرتے ہیں جنھیں علم میں رسوخ رکھنے والے افراد کے سوا کوئی عام حالات میں Detect نہیں کر پاتا۔ چنانچہ ایسے افراد کے ذریعہ پہلے مرحلے میں طویل کتابیات کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں ان کتابیات سے حوالے Annotated کئے جاتے ہیں۔ اور آخری مرحلے میں اصل متن لکھا جاتا ہے اور پھر یہ تینوں باہم مدغم کر دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اب چونکہ بہت بڑی تعداد ایسے اساتذہ کی 'موجودگی' رکھتی ہے جو Potential استعداد سے بالکل عاری ہے لہذا ان حالات نے انھیں چند مذموم رویوں کا عادی بنا دیا ہے جن کے مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں مثلاً:

ا۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بالخصوص مغرب میں اپنی استعداد کو غلامانہ اور مغلوبانہ استعمال کے لئے بلاشرط پیش کر دینا۔

۲۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک 'استعداد' کو Misuse، Disuse یا Underutilize کر کے انھیں محض 'مالی منفعت' (Financial Gain) کا ذریعہ بنا دینا۔ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور فارغین کا فوج درفوج مشرق وسطی جانا بھی اسی ذہنیت کی عکاس ہے۔ قومی، معاشرتی اور انسانی سطح پر انسانی وسائل (Human Resources) کا بالخصوص مسلم انسانی وسائل جو اس ملک میں 'Highly Scarce' ہونے کے سبب انتہا درجے کے 'Constraint' شمار ہوتے ہیں کا بدترین زیاں کرنے والوں میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساتذہ اور ان کے تتبع میں وہاں کے فارغین سرِ فہرست ہیں۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ترقی (Promotion) اور استحکام کے لئے اساتذہ کا حالیہ چند برسوں میں بعض چھچھوری اور مضحکہ خیز حرکتوں اور اعمال پر اتر آنا مثلاً:

ا۔ اپنے تحریری، تصنیفی یا علمی تفوق کو ثابت کرنے کے لئے حقیقی علمی کارناموں کو انجام دینے کی بجائے ذرائع ابلاغ بالخصوص اردو اور ہندی اخبارات (Vernaculars) میں (الف) اپنے مغربی ممالک کے اسفار کی خبر چھپوانا (ب) وہاں کے کسی غیر

معروف جیبی ادارے کی رکنیت دیئے جانے کی خبر چھپوانا (ج) وہاں کے کسی غیر معروف یا جیبی ادارے کی جانب سے خطاب، ایوارڈ یا انعام دیئے جانے کی خبر چھپوانا۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساتذہ کا حقیقی سطح پر Actually یا Virtually ہر طرح کی علمی گفتگو، تبادلۂ خیال، مباحثہ، مکالمہ، مراسلہ اور مکاتبہ حتیٰ کہ مشافہہ سے مستقل، کلی اور حتمی گریز کرنا اور بد قسمتی سے اتفاقی طور پر Encounter ہو جانے کی صورت میں ایسے رویئے کا اظہار کرنا گویا انھیں غیر معمولی علمی، فکری، تصنیفی، تحقیقی اور تجرباتی امور نے اس قدر جذب اور مشغول کر رکھا ہے کہ ایسے ثانوی یا غیر ضروری امور کے لئے وقت فارغ کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ انھیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہے کہ ان کے استعداد سے عاری ہونے کے سبب علمی مباحثہ سے فرار اختیار کرنے کے لئے یوں Nerd بننے یا ظاہر کرنے کے عمل نے پوری دنیا میں انھیں 'ہدفِ تمسخر' یا 'اضحوکہ' (Laughing Stock) بنا کر رکھ دیا ہے۔

۶۔ علمی استعداد کا عمومی (Across the board) انحطاط اساتذہ اور ان کے تتبع میں طلبہ و طالبات میں متعدد اقسام کی اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوا ہے۔ ایسی متعدد اخلاقی خرابیوں میں سے سب سے بری اور دور رس نتائج کی حامل اور متعدی خرابی یونیورسٹی میں 'متحارب ماحول' (Internecine Atmosphere) کا پیدا ہو جانا ہے۔ اس کے کئی ابعاد (Dimensions) ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

(الف) برسر کار اساتذہ کی جو باہم خواہ متحارب ہی کیوں نہ ہوں مشترکہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی صاحبِ استعداد ان کے شعبے میں بحیثیت استاذ بحال نہ ہو حتیٰ کہ امیدوار ان کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔

(ب) بعض مسند نشیں اساتذہ (ہیڈ، چیرمین یا ڈین) سبک دوش اور بالخصوص ریٹائرڈ ہو جانے والے پیش رو مسند نشیں کے ساتھ ذلالت کی حد تک بدسلوکی پر اتر آتے ہیں خواہ وہ ان کا استاذ اور محسن ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ درج کیا جائے:

سید محمد افضل تحریر فرماتے ہیں:

''سرور صاحب یونیورسٹی کے اسی دور میں استاد تھے کہ جب شعبے کا ہیڈ وظیفہ یابی تک شعبے کا ہیڈ رہتا تھا۔ ممکن ہے اس زمانے میں کچھ لوگ ان سے ناراض رہے ہوں۔ عموماً بااختیار لوگوں سے جانے انجانے کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی علمی کاوشوں کو بھی بھلا دیا جائے۔ اس ضمن میں کچھ باتیں تحریر کر رہا ہوں۔ جب سرور صاحب کی شعبہ جاتی حکومت شعبۂ اردو سے ختم ہوئی اور عنانِ اقتدار ان کے وارث کے پاس آئی تو ایک صاحب، جو سرور صاحب کے شاگردِ رشید رہ چکے تھے اور اپنی ایک تصنیف بھی ان کو معنون کر چکے تھے، انھوں نے سراج اورنگ آبادی کا مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

'سرور' اور 'شاخِ نہالِ غم' کے پس منظر سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ حالانکہ جنھوں نے نہالِ غم کی خوشبوؤں کے لئے یہ شعر پڑھا تھا، ان ہی کو نہالِ غم نے اسیرِ غم کر دیا اور ان کے مقابلے میں بظاہر ایک بے حد ناقابل شخص کو مرتبہ عطا کیا۔ اور پھر جس طرح وہ نہالِ غم زندگی کے آخری لمحات میں ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج و ماؤف ہوا، اللہ سب کو اس سے بچائے۔

یہ لمحۂ موجود ہی وہ روز جزا ہے
جس پر تجھے کس درجہ یقیں تھا کہ نہیں ہے
تو منکر قانونِ مکافات عمل تھا
لے دیکھ ترا عرصۂ محشر بھی یہیں ہے

میں علی گڑھ میں طالب علم تھا اور برادر بزرگ سید محمد اشرف وہاں انکم ٹیکس افسر تھے۔ یوم آزادی کا مشاعرہ آرٹس فیکلٹی میں منعقد کیا گیا۔ مشاعرہ رات کو دیر تک چلا۔ سرور صاحب

اور بیگم صاحبہ بھی موجود تھے۔ مشاعرے کے بعد رات میں رکشے والے شدید سردی کی وجہ سے جا چکے تھے۔ اور صاحب ثروت لوگ اپنی گاڑیوں میں اپنے دوستوں کو لئے جا رہے تھے۔ یقین جانئے سب نے سرور صاحب کو ایسے نظر انداز کیا جیسے ان پر نظر ہی نہ پڑی ہو۔ اشرف بھائی کو میں نے تفصیل سے آگاہ کیا اور وہ منت سماجت کر کے دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر اشرف بھائی نے سودا کا ایک شعر پڑھا تھا۔

کس ہستی موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

[ملاحظہ فرمائیں: خبرنامہ شب خون: نمبر ۱۷: فروری تا اپریل ۲۰۱۲ء]

گزشتہ ساٹھ سالوں میں اس اخلاقی زوال کی بھرپور جھلک اطہر صدیقی کی خودنوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' کے سطور اور اس سے زیادہ اس کے بین السطور میں مل جاتی ہے۔

(ج) اساتذہ یا ان کے ماتحتوں کے ذریعہ شعبے میں سینئرز، ہم رتبہ یا جونئر اساتذہ کی ڈاک یا تو غائب کر دی جاتی ہیں یا غلط اطلاعات دے کر واپس کر دی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے تین اقسام کے واقعات کا انکشاف ہوا:

۱۔ ایک خط مرسِل کے پاس واپس آ گیا جس پر تحریر تھا: 'مرسَل الیہ بیرونِ ملک گئے ہوئے ہیں لہذا خط واپس ہو' جب کہ مرسِل کو پورا علم تھا کہ مرسَل الیہ دو دن قبل بیرونِ ملک گئے ہیں اور تیسرے دن واپس آ جانے والے ہیں۔

۲۔ ایک خط مرسِل کے پاس واپس آ گیا مرسَل الیہ شعبے کا چیرمین تھا۔ محکمۂ ڈاک کی جانب سے شعبہ کے ہیڈ کے حوالے سے تحریر تھا: 'Retired, Left W/A یعنی مرسَل الیہ وظیفہ یاب ہو کر اور بغیر پتا دیئے چلے گئے ہیں'۔ جب کہ مرسِل کو خوب معلوم تھا کہ مرسَل الیہ یعنی شعبہ کے چیرمین گزشتہ تقریباً چونتیس سالوں سے یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں اور اس سے قبل اسکول سے پی ایچ ڈی تک وہ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم اور ریسرچ اسکالر رہے ہیں گویا وہ گزشتہ پچاس سالوں سے مسلم یونیورسٹی میں رہتے

چلے آئے ہیں۔ یونیورسٹی سے 1000 میٹر کے اندر ان کا ذاتی مکان ہے۔ مرسِل کی صرف اتنی سی خطا تھی کہ اسے معلوم نہ تھا کہ مرسَل الیہ صرف چند ہفتوں قبل وظیفہ یاب ہو چکے ہیں اور انھیں یہ خط شعبے کے پتے پر بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن مرسِل کے لئے اس سے بھی زیادہ عبرت ناک واقعہ وہ ہوا جو اس کے بعد رونما ہوا۔ اس نے اسی خط کو بغیر کھولے دوسرے لفافے میں اب مرسَل الیہ کے رہائش گاہ کے پتے پر بھیج دیا۔ ایسا کرنے کی منشا یہ تھی کہ مرسَل الیہ بچشم خود دیکھ لیں کہ ان کی ڈاک کے ساتھ ان کے 'خلفا' نے کیا سلوک کیا ہے۔ چند ہی دنوں میں ان کا جواب آیا اور مرسِل حیران رہ گیا کہ اس واقعہ کا انھوں نے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا یعنی نوٹس ہی نہیں لیا گویا ایسا ہونا ان کے نزدیک باعثِ حیرت تھا نہ افسوسناک۔ اس موقع پر عاجز کو وہ کہانی یاد آگئی

''جب ایک دن ایک اکلوتے بیٹے نے اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کو کاندھے پر اٹھایا تو باپ نے پوچھا: بیٹے! مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ بیٹے نے جواب دیا: باپو! شہر علاج کروانے لے جا رہا ہوں۔ بیٹا باپ کو پیٹھ پر لاد کر چلنے لگا۔ باپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد بیٹا رک گیا۔ باپ نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا تو جنگل میں ایک سنسان جگہ تھی جہاں نیچے گہرا کھڈ تھا۔ اس سے پہلے کہ بیٹا کچھ کہتا بوڑھے اور بیمار باپ نے کہا: بیٹا! تھوڑا اور آگے لے چلو۔ یہ جگہ تو وہ ہے جہاں میں نے تیرے دادا کو پھینکا تھا۔''

۷۔ روئے ارض پر موجود عام انسانی اخلاق کے مقابلے میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں علمی، فکری اور اخلاقی زوال کس نچلی سطح تک آچکا ہے اس کے موازنہ کے لئے عاجز ایک ایسے واقعے کا ذکر کرتا ہے جس کا اسے ذاتی تجربہ ہوا۔ یہ بات 84-1983 کے آس پاس کی ہے۔ عاجز ایک مؤقر علمی جریدے کی ایک خصوصی اشاعت کا ادارتی ذمہ دار تھا۔ اس نے عالمی سطح کے چند اہل علم سے جن میں بعض معروف مستشرقین بھی تھے، رابطے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں عاجز نے ایک عنوان مشہور مستشرق ڈاکٹر ٹرال (Dr. Troll) کے لئے بھی تجویز کیا۔ مشکل یہ تھی کہ ان کا موجودہ پتا عاجز کو معلوم نہ تھا چنانچہ عاجز نے

دس سال قبل کے اس پتے پر انھیں خط بھیج دیا جو ہندوستان میں قیام کے دوران ان کا پتا تھا۔ تقریباً پندرہ دنوں بعد ایک صاحب ملاقات کو آئے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ڈاکٹر ٹرال نے بھیجا ہے۔ رات ان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں آپ سے ملوں اور ضروری تعاون دوں۔ غالباً آپ نے انھیں خط لکھا تھا۔ جس پتے پر آپ کا خط گیا تھا وہاں کے ذمہ داروں نے وہ خط انھیں بھجوا دیا جس کے بعد انھوں نے آپ سے رابطہ کرنے کی تاکید کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر ٹرال ہندوستان سے جرمنی چلے گئے تھے اور اس وقت وہ ویٹیکن میں ہیں۔

فکری اور علمی اعتبار سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آئے اخلاقی زوال کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ گزشتہ پچیس سالوں میں واقع ہونے والے ایسے چند واقعات 'مشتے از خروارے' صورتحال کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہوں گے:

ا۔ عاجز ان دنوں سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعض دقیق پہلوؤں پر کام کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کسی ایسے عنوان پر کام کرتے ہوئے ہندوستان میں کسی بھی علمی تعاون کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے سب سے عظیم الشان تعلیم گاہ کی جانب جہاں عدیم النظیر علمی منابع اور مصادر اور اہل علم پائے جاتے ہیں خیال کا جانا لازمی تھا۔ چنانچہ اس نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے کم از کم تیس اہل علم سے جن میں اکثر پروفیسرز تھے اور جو مختلف فیکلٹیوں سے تعلق رکھتے تھے متعلقہ عنوانات پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ہی بات کہہ کر کسی بھی قسم کے تعاون دینے سے معذرت کر لی۔ ہر ایک نے مطلع کیا کہ وہ از حد مشغول ہیں۔ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دقیق پہلوؤں میں دو عنوانات اور ان پر عاجز کو ملے جوابات کا ذکر باعثِ عبرت ہوں گے۔ یہ دو عنوانات درج ذیل ہیں:

ا۔ ''ساتویں صدی عیسوی میں اسلام اور سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سنسکرت، اگمی، پراکرت اور پالی لٹریچر میں موجود مواد''۔

۲۔ ''پنجابی Folklore، شاہ مکھی اور گورمکھی لٹریچر میں سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

اثرات۔

دوسرے عنوان پر جب عاجز نے ایک ایسے سکھ دانش ور، صاحب طرز مصنف اور محقق سے جو عالم عربی میں بھی اپنی عربی تصنیفات کے لئے جانے جاتے ہیں رابطہ کیا تو وہ فوراً تیار ہو گئے اور اس عنوان پر اپنا مقالہ دو مہینوں کے اندر اندر ارسال کر دیا۔

سب سے بڑی مشکل اول الذکر عنوان سے متعلق تھی۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ کلکتہ میں رہنے والے ایک محقق ڈاکٹر سُکھو پادھیائے سے رابطہ کروں۔ شاید وہ تیار ہو جائیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے صاحب علم ہیں اور ان کا مطالعہ از حد گہرا اور وسیع ہے۔ عاجز نے انھیں خط لکھا۔ فوراً جواب آیا۔ انھوں نے لکھا کہ میرے لئے سعادت کی بات ہوگی کہ میں اس عنوان پر مقالہ لکھوں۔ لیکن میرے نزدیک دو موانع ہیں۔ اولاً آپ کی یہ قید کہ مقالہ ایک مہینے میں بھیج دیا جائے۔ اگر آپ اس مدت کو دو مہینے کر دیں تو مجھے آسانی ہو جائے گی۔ دوسرا مانع میری صحت ہے۔ میں بہت سن رسیدہ اور ضعیف ہو چکا ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ اگر نہ لکھ سکا تو مجھے معذور سمجھیں۔ میں نے فوراً لکھا کہ آپ دو مہینے میں مقالہ ارسال فرمادیں۔ ان کے بیٹے کا جواب آیا کہ والد صاحب کا تین دنوں قبل دے ہانت ہو گیا۔ آپ کا خط دے ہانت کے دوسرے دن ملا۔ لہذا آپ کو صورتحال سے مطلع کیا جاتا ہے۔

۲۔ تقریباً تیس سال قبل عاجز ''بیسویں صدی میں اسلامی علمی پیش رفت'' کے عنوان سے ایک اشاعت کی تیاری کا ذمہ دار تھا۔ اس نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اہل علم سے رابطہ کیا۔ کسی کا تعاون نہ مل سکا۔ معذرت کی کم و بیش دو صورتیں سامنے آئیں۔ اکثریت نے خط کا سرے سے جواب ہی نہیں دیا اور جواب دینے والوں نے یہ لکھا کہ وہ ضروری کاموں میں از حد مشغول ہیں لہذا تعاون دینے سے قاصر ہیں۔ اسی عنوان کے تحت عاجز نے برطانیہ کے مشہور مذہبی رہنما اور مستشرق Rev. Kenneth Cragg سے رابطہ کیا۔ اسی سلسلے اور اسی نوعیت کا خط جو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اہل علم کو بھیجا گیا تھا ریورینڈ کریگ

کو بھی بھیجا گیا۔ عاجز نے ان سے ایک نادر اور غیر معمولی عنوان پر مقالہ تحریر فرمانے کی درخواست کی۔ عنوان تھا:

''بائبل کے عہد ساز مفسر (1890-1801) J.H. Newman اور قرآن کے بیسویں صدی کے معروف مفسر مولانا مودودی کی تفسیری تعبیرات وتاویلات (Exegetical Hermaneutics) کا تقابلی مطالعہ''۔

ریورینڈ کریگ کا جواب آیا۔ انہوں نے لکھا کہ ان کے لئے سعادت کی بات ہوتی کہ وہ اس عنوان پر تقابلی مطالعہ پیش کرتے۔ انھوں نے لکھا: ایسا لگتا ہے کہ آپ (عاجز) میرے موجودہ احوال سے واقف نہیں۔ میں Nonagenarian ہو چکا ہوں۔ ضعف انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ گزشتہ ایک سال سے صاحب فراش ہوں۔ کاش میں آپ کی خواہش پوری کر سکتا۔ مجھے معذور سمجھیں۔ تاہم کیا میں یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ جب یہ کاوش شائع ہو جائے تو آپ مجھے اس سے استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ تقریباً پانچ چھ ہفتوں کے بعد خط موصول ہوا۔ لکھا تھا: ریورنیڈ کا فلاں تاریخ کو انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے ٹیبل ڈائری میں ایک کاغذ پر آپ کا پتا تحریر تھا لہٰذا اس کی اطلاع آپ کو دی جاتی ہے۔

۳۔ اخلاقی زوال کے اسی سلسلے میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساتذہ کا ایک مخصوص طرزِ عمل قابلِ ذکر ہے۔ ایک صاحب نے جو مسلمانوں کے احوال کی حقیقت جاننے اور ان کی اصلاحِ حال کے لئے منصوبہ بندی کرنے پر کام کر رہے تھے بتایا کہ ایک ہمہ جہت سروے اور منصوبہ بندی سے قبل انہوں نے رابطے کے لئے صورت یہ اختیار کی کہ ایک رسالہ (Brochure) بطور 'بیک گراونڈر' لکھ کر مطبوعہ شکل میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی بعض فیکلٹیوں کے تقریباً سو اہل علم (لیکچررز، ریڈرز اور پروفیسرز) کو بھیجا۔ چونکہ یہ سارے رسالے رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجے گئے تھے اس لئے ابتدائی چند رسالے وہاں موصول ہو گئے جن کی دوسرے ذرائع سے تصدیق ہو گئی۔ پھر رسالے ڈاک سے واپس آنے شروع ہو گئے۔ انھیں سخت حیرت ہوئی۔ ان کے دفتر میں بیسوں واپس شدہ رسالے رکھے ہوئے

تھے۔ ابھی عاجز سے وہ اس صورتحال کا ذکر کر ہی رہے تھے کہ کلکتہ سے ایک شناسا جو ایک دن کے لئے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں رکے تھے اور صبح کی ٹرین سے تھوڑی دیر قبل دہلی تشریف لائے تھے داخل ہوئے۔ دورانِ گفتگو صاحب معاملہ نے فرمایا کہ رسالوں کا واپس آجانا بہت قابلِ ذکر نہیں نا قابل فہم دراصل وہ عبارت ہے جو تقریباً ہر رسالے پر تحریر ہے۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ہر رسالے پر لکھا ہے: 'Out of India' لہذا ڈاک واپس ہوئی۔ کلکتہ سے آنے والے شناسا نے دریافت کیا کہ کن کن لوگوں کی ڈاک واپس آئی ہے؟۔ انھیں چند نام بتائے گئے۔ اس پر انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کل میں سارا دن یونیورسٹی میں ہی رہا۔ ان میں سے فلاں فلاں اساتذہ سے میری ملاقات ہوئی اور فلاں فلاں پر نظر پڑی۔ ان میں شاید ہی کوئی اس وقت بیرونِ ملک کے دورے پر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسے تمام علمی تعاون سے انکار کرنے کے لئے ایسی ترکیب اختیار کی جاتی ہے تاکہ علمی وقار بھی برقرار رہے اور ان خرخشوں سے پیچھا بھی چھوٹ جائے۔ ممکن ہے اس سے یہ تاثر بھی دینا مقصود ہو کہ یہ بڑی علمی شخصیتیں ہیں جن کی بیرونِ ملک اور بالخصوص مغربی علمی دنیا میں بہت طلب ہے اور وہ ان اہم علمی مشاغل میں اتنے منہمک ہیں کہ انھیں غیر ضروری کاموں کے لئے فرصت میسر نہیں۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو کہ ان کے رویوں نے محکمۂ ڈاک کے تن آسان اہل کاروں کو جری بنا دیا ہو اور وہ خود ایسا کرنے لگے ہوں۔

۸۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا علمی اور اخلاقی زوال اب ایک نہایت خطرناک مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے جس کی تصدیق مختلف ذرائع، واقعات اور حادثات سے ہو رہی ہے تو پھر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے لئے اس سے بری خبر اور اس سے بڑی ہلاکت کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ تیس سالوں سے بالعموم اور بیس سالوں سے بالخصوص یونیورسٹی میں ایسی ذہنیت کو بوجوہ فروغ مل رہا ہے جو مسلم یونیورسٹی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔

جو اہلِ علم مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی تاریخی نازکی کا ادراک رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج اپنے قیام سے آج تک پل صراط سے گزر رہا ہے۔ اس کی تاریخ میں سب سے بڑا اور

مہلک فساد 1907-1906 میں پیدا ہوا جس کا اصلی سبب وہ ذہنی تصادم تھا جو سرسید اور شبلی کے مابین گزشتہ بائیس سالوں سے ہو رہا تھا۔ محسن الملک اور وقار الملک بہرحال سرسید نہ تھے۔ چنانچہ اس فسادِ قلب ونظر نے انفجار کی شکل اختیار کر لی جس نے سرسید کی تحریکِ کالج کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا جس سے یونیورسٹی آج تک باہر نہیں آسکی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

(۱) David Lelyveld: Aligarh's First Generation: Life of the Mind; Princeton University Press, 1978

(۲) محمد بدرالدین (علیگ): مرقع کالج: باب ہفتم: شورش ۱۹۰۷، طبع اول: مطبع مطلع العلوم، مراد آباد ۱۹۱۶، اشاعت ثانی ۲۰۰۵ء باہتمام محمد قاسم صدیقی ابن محمد بدر الدین علیگ (1887-1936)

(۳) شبلی نعمانی: مقالات شبلی جلد دوم (مرتبہ سید سلیمان ندوی: سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر: محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ، مئی ر ۱۸۹۸)

(۴) شبلی نعمانی: خطبات شبلی: علما کے فرائض: اعظم گڑھ، معارف 1965)

(۵) شبلی نعمانی: مقالات شبلی جلد اول (مرتبہ سید سلیمان ندوی: اختلاف اور مسامحت اور اختلاف کے ساتھ اتحاد)

اسی فسادِ قلب ونظر نے 21-1920 کی شورش کو جنم دیا۔

ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ڈاکٹر معین الحق: معین بیتی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی 1993

(۲) Dr. Ishrat Ali Siddiqui: Aligarh: Past and Present: 1992

(۳) ڈاکٹر ذاکر حسین: کچھوا اور خرگوش: نیشنل بک ٹرسٹ، 1970

(۴) ڈاکٹر ذاکر حسین: تعلیمی خطبات: مکتبہ جامعہ، 1988

(۵) پروفیسر محمد مجیب: خانہ جنگی: 1976

(۶) Prof. M. Mujeeb: The Indian Muslims, London: George Allen & Unwin: 1967

(۷) ڈاکٹر ذاکر حسین: بنیادی قومی تعلیم: 1939

(۸) پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: صفحہ 118-111: جرنل خدا بخش لائبریری، 50، 1989، پٹنہ

حالیہ دنوں میں متعدد واقعات اس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہ فسادِ قلب ونظر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں پھر سر اٹھا کر مائل بہ انفجار ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو اس بار مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جاں بر نہ ہو سکے گی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق: اگست ۲۰۱۲ عیسوی کا اداریہ اسی ممکنہ انفجار کی جانب اشارہ کر رہا ہے:

''جلد اول (قرآن نمبر) کے ایک مقالہ'' آدم، حوا اور عیسی کی پیدائش: قرآنِ کریم اور روایات کی روشنی میں'' پر ہمیں سخت وست، سب وشتم سے گزرنا پڑا، ہمارے کچھ اساتذۂ کرام اور معدودے عزیز طلبہ نے ہمیں جن ناگفتہ بہ القاب وآداب سے نوازا انھیں لکھنا تو درکنار انہیں زبان پر لانا بھی ہمیں گوارا نہیں۔ اس سے تو اس درسگاہ اور تربیت گاہ کا وقار مجروح ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ'' سباب المسلم فسوق وقتاله كفر '' سے ہم واقف نہیں ہیں۔ بارہا اساتذۂ کرام اور طلبہ سے عجز وانکسار کے ساتھ ملتمس رہا کہ اس کا ایک ہی حل ہے کہ مدلل ومسکت جواب دیا جائے لیکن یہ التماس بے اعتنائیوں کا شکار رہی..........

''کیا سرسید کے اس علمی شہر میں تحقیق وتنقید کا یہ نہج مناسب ہے؟''

یہ صورتحال ایک ہولناک طوفان کی آمد آمد کی خبر دے رہی ہے۔

سفر نصیب

۱۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632) کے بعد کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ واقعۂ کربلا (680) کے بعد امت مسلمہ محمدیہ کی فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی بحالی کے لئے سب سے توانا اور معجز آثار آواز انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں بلند ہوئی۔ یہ آواز تھی مرزا اسداللہ خاں غالبؔ (1869-1797) کی۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند — شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند — دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم بر چیدند — بہ عوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکان پشنگی بردند — بہ سخن ناصیۂ فرّ کیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بہ دانش بستند — ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

(۱۸۳۷۔۳۸)

680 عیسوی کے بعد امت مسلمہ ایک ایسے دورِ مظلمہ میں داخل ہوگئی تھی جس نے رفتہ رفتہ اس کی ساری توانائیاں سلب کر کے اس کے جسد کو معطل اور زندہ لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس تعطل اور نیم جانی

نے اسلام کو زندگی کے میدانِ عمل سے عملاً بے دخل اور قرآن اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو مجحوب بنا کر رکھ دیا تھا۔ اصلاح کرنے، اسے قبول، جذب اور بارآور کرنے اور ایسی اصلاح کو استحکام بخشنے کی ہر قوت معدوم ہو چکی تھی۔ اسلامی تاریخ میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ وہ پہلی شخصیت ہے جو اس حقیقت سے آگاہ ہوئی کہ امت کی اس کیفیت کی کنہہ کیا ہے؟ اور اس کیفیت سے نکلنے کی راہ کون سی ہے؟

غالبؔ نے آگاہ کیا کہ 680 عیسوی کے بعد امتِ مسلمہ محمدیہ جس 'بیماری' میں مبتلا کر دی گئی ہے اسے 'تکییف' (Conditioning) کہتے ہیں۔ اور اس 'تکییف' سے نکلنے کی شاہ کلید 'علم' کی بازیافت ہے۔ 'علم کی بازیافت' سے مراد 'قرآنی انسان' کی بازیافت ہے۔ یہ عرش کی آواز تھی جو غالبؔ کے نطق سے بلند ہوئی۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ نے امت کو اور ان کے حوالے سے مظلوم انسانیت کو اصل زمینی حقائق سے آگاہ کیا۔ ان تبدیلیوں کی آگاہی دی جو روزِ روشن کی طرح سامنے تھیں۔ غالبؔ نے انسانیت کو سنت اللہ سے ہم آہنگ ہونے، ارادۂ اللہ کا ادراک کرنے اور منصوبۂ ربانی کا حصہ بننے کی ترغیب دی۔ چودہ سو سالوں کے قرونِ مظلمہ میں رہتے رہتے انسانی ذہن و فکر پر جو گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی تھی اس سے نکلنے کی ہمت دلائی۔ معرکۂ خیر و شر جس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا اس کا حقیقی ادراک کرنے اور خیر کی قوتوں کا حصہ بننے کا احساس دلایا۔

سر سید غالبؔ کے پہلے معنوی فرزند ثابت ہوئے۔ غالبؔ کا لاہوتی انفجار واقعۂ کربلا کے بعد واقع ہونے والا سب سے بڑا اور توانا انفجار تھا جس نے یکے بعد دیگرے تین متسلسل انفجارات کو جنم دیا۔ یہ تین انفجارات درج ذیل ہیں:

۱۔ سر سید (1817-1898) کا فکری انفجار

۲۔ حالیؔ (1837-1914) کا علمی انفجار

۳۔ اقبالؔ (1875-1938) کا حُرکی انفجار

امتِ مسلمہ کو اس تاریخی 'تکییف' (Conditioning) سے باہر نکالنے کی سر سید کی کوشش سب سے عظیم الشان فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی کوشش تھی۔ اس فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی کوشش کا ہدفِ اولین ایسی 'فضا' (Environment) کی تشکیل و تعمیر تھا جہاں اس 'علم' کی بازیافت ہو جس سے 'قرآنی

انسان' کی بازیافت ممکن ہو جائے۔

۲۔مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا۔۔(جس کا اولین خاکہ 'مدرستہ العلوم' اور پھر اینگلو محمڈن اورینٹل کالج کی شکلوں میں ظاہر ہوا) مقصدِ اولین ایک ایسے ادارے، نظامِ تعلیم، معلمین اور تعلیم گاہ کے معرض وجود میں لانے کا تھا جہاں 'قرآنی ذہن، قرآنی فکر، قرآنی علم اور قرآنی اخلاق سے مزکی' انسان پیدا کئے جائیں جنھیں بجا طور پر 'قرآنی انسان' یا 'مومنِ خالص' کہا جا سکے۔ ایسے انسان جن کے دماغ قرآنی علوم سے پرداختہ ہوں، جن کی رگ و پے میں قرآنی حکمت، قرآنی برہان اور قرآنی حرارت خون کی طرح رواں ہوں اور جو انسانوں کے مابین اس ذمہ داری کو اٹھانے کے اہل، اس کے لئے مستعد اور اس کی ادائیگی کے لئے برسرِ عمل ہوں جس کے لئے قرآن کا نزول ہوا ہے۔

۳۔سرسید کے ذہن میں جس 'قرآنی انسان' کا خاکہ تھا اس کی بہترین تفہیم وہ مراسلت کرتی ہے جو سرسید اور نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں کے مابین ہوئی تھی بالخصوص وہ خط جو سرسید نے محسن الملک کے خط (مورخہ ۹/ اگست ۱۸۹۲ بمقام حیدر آباد دکن) کے جواب میں (مورخہ ۱۷/ اگست ۱۸۹۲ بمقام الہ آباد) ان کو لکھا۔ سرسید بالیقین اپنی حیات میں وہ سب کچھ نہیں دیکھ پائے جن کے وہ خواہشمند اور جن کے لئے کوشاں تھے۔ چودہ سو سال کی تاریکی اور معطلی سے اتنی کم مدت میں باہر نکل آنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اسی احساس کا اظہار اقبال نے یوں کیا ہے:

تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

(اقبال: بالِ جبریل: حصہ دوم: ۵)

مسلمانوں کی تاریخ میں چودہ سو سالوں سے جاری زوال کا بنیادی سبب 'تکلیف' (Conditioning) ہے۔ مسلم معاشرے میں 661 عیسوی میں قائم کی جانے والی یہ 'تکلیف' (Conditioning) دو عناصر کے باہمی تعاون و تعاہد کا نتیجہ تھی۔ یہ دو عناصر تھے:

۱۔حکمراں۔۔۔اور

۲۔علما۔

چنانچہ ان دونوں عناصر نے مسلم معاشرے میں دو طرح کی تکلیفیں (Conditionings) قائم کر کے پوری ملت کو دو خانوں میں بانٹ کر قید کر دیا۔ ان دو مکلیف خانوں نے امت کو دو اقسام کی صورتحال میں مبتلا کر کے رکھ دیا:

۱۔عَمُودِی ثَنَوِیَّت (Vertical Dichotomy)اور

۲۔اُفُقِی تَرَادُفِیت(Horizontal Dualism)

۴۔ سرسید ہر چند کہ اپنی کوششوں میں ناکام نہیں ہوئے لیکن وہ اپنی زندگی میں پوری طرح کامیاب بھی نہ ہوسکے۔ان کی ناکامی کاواحد سبب 'مسلم تاریخ' کی وہ 'روایت' (Legacy) ہے جس سے امت ابھی تک آزادنہیں ہوسکی تھی۔ یہ 'روایت'' عمودی ثنویت' (Vertical Dichotomy)اور 'افقی ترادفیت' (Horizontal Dualism) قائم کرنے اور اسے تھامے رکھنے والے دو تاریخی عناصر کا امت کے ذہن وفکر پر اب بھی موثر حیثیت سے باقی رہنا تھی۔ سرسید اپنی حیات میں مسلم حکمرانوں (؟) اورعلما کے سبب اس تکییف (Conditioning) کوزائل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی موجودہ صورتحال اسی ناکامی کی بھرپورعکاسی کرتی ہے کہ وہاں آج 'قرآنی انسان' یعنی 'قرآنی ذہن، قرآنی فکراورقرآنی اخلاق سے مزکّی انسان' عنقا ہے۔آج وہاں—سنی ہیں، شیعی ہیں، مقلد ہیں، غیر مقلد ہیں، دیوبندی ہیں، بریلوی ہیں، سلفی ہیں، خانقاہی ہیں، تحریکی ہیں، تبلیغی ہیں، اشتمالی ہیں، اشتراکی ہیں، دُعَاۃ ہیں، قُضَاۃ ہیں، بَحَّاث ہیں، لَسَّان ہیں، رَسَّام ہیں، بنَّا ہیں، زمین دار ہیں، تاجر ہیں، پیٹروڈالر والے ہیں، متغرب ہیں، متشرق ہیں، بہاری ہیں، ملیالی ہیں، بنگالی ہیں، آسامی ہیں، اودھی ہیں، پوربی ہیں، مصطفیٰ آبادی ہیں—غرض سب ہیں لیکن 'انسان کامل' کوئی نہیں۔ ہر طبقے کا اپنا مذہب ہے، مسلک ہے، مشرب ہے۔ ہر طبقے کا اپنا مرشد ہے، اپنا موجِّہ ہے۔ ہر مذہب مکمل اور خودکفیل ہے۔خوداختیار ہے، خودآشنا ہے۔ خودبین ہے، خودپسند ہے، خودرُستہ ہے، خودرنگ ہے، خودکارہ ہے، خودکاشت ہے، خودکامہ ہے، خودمراد ہے، خودمان ہے۔اسے زیست کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ہر طبقے کے مطامح، اہداف اورترجیحات جداگانہ ہیں۔

ثنویت وترادفیت

۱۔ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کسی صورتحال میں انسانی معاشرے میں۔۔ حکمراں، حکومت یا نظام ۔۔کی صورت میں ایسی کوئی قوت کبھی پیدا نہیں ہوئی جو کسی قوم کی بصیرت (Vision) پر قدغن لگا سکے۔ تفکیر کی سطح پر، نہ تدبیر کی سطح پر اور نہ ہی تعمیل کی سطح پر۔ ان حالات میں ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے:

گزشتہ تین سو سالوں سے بھارت میں مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس زوال وانحطاط کا منبع کہاں ہے؟ اصلاحِ احوال کی ہر کوشش کیوں ناکام ہوگئی؟ اور بالآخر لازماً یہ سوال کہ اس زوال وانحطاط کے منبع کو بند کرنے کی تدبیر کیا ہو؟

۲۔ زمانہ عرصۂ عمل ہے جہاں ہر لمحے حوادث (Events) رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر حادثے (Event) کے پیچھے کچھ عوامل (Factors) اور کچھ اسباب (Reasons) لازماً ہوتے ہیں۔ روئے ارض پر رونما ہونے والا ہر حادثہ عموماً تین قسم کے اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے:

۱۔ اصلی (Core)

۲۔ متجانبی (Collateral) —— اور

۳۔ ضربی (Multiplex)۔

اسی طرح ہر سبب کے پیچھے کوئی عاملِ اصلی ضرور ہوتا ہے۔ ان تمام اسباب (Reasons) میں اصلی (Core) سبب بھی لازماً صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ بقیہ اسباب اس اصلی سبب کے ہم رکاب یا رِدْف ہوکر اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں تا آں کہ کوئی حرکت واقعہ/حادثہ (Event) کی شکل میں رونما ہو جاتی ہے۔

۳۔ چنانچہ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ گزشتہ تین سو سالوں میں مسلمانوں کے لامتناہی (Unending) اور ناقابلِ انسداد (Unstoppable) زوال وانحطاط کا اصلی سبب (Core Reason) کیا ہے؟ اور اس کے پیچھے کون سا بنیادی عامل (Factor) کارفرما رہا ہے؟

(1700-2012) کی درمیانی تاریخ کا مطالعہ دو طرح کے اسباب کی نشاندہی کرتا ہے:

۱۔ روایتی وموروثی سبب (Traditional & Hereditary Reason) —— اور

۲۔ معاصر سبب (Contemporary or Immediate Reason)

(الف) روایتی وموروثی سبب: اس سے مراد وہ سبب ہے جو مسلمانوں کو 1700 عیسوی میں اپنی سابقہ تاریخ سے ورثے میں ملا۔ یہ روایتی وموروثی سبب ایک 'دورویہ شاخسانہ' (Two-Branched outgrowth) کے مانند تھا جس کی 'دو ظاہرات' تھیں:

۱۔ مسلم معاشرے کی عمودی ثَنَویّت کی ظاہرہ

(Phenomenon of Vertical Dichotomy of the Muslim Society)

۲۔ مسلم معاشرے کی اُفُقی تَرَادُفیّت کی ظاہرہ

(Phenomenon of Horizontal Dualism of the Muslim Society)

۱۔ مسلم معاشرے کی عمودی ثنویت کی ظاہرہ (Phenomenon of Vertical Dichotomy of the Muslim Society): نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات انسانی تاریخ کا عدیم النظیر حادثہ تھی جس نے بالعموم نسلِ انسانی کو اور بالخصوص مسلمانوں کو ایک عظیم نقصے سے دوچار کردیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ہی سالوں بعد مسلم معاشرے میں دو طبقے اچانک نمودار ہوئے جنھوں نے دیکھتے دیکھتے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ 661 عیسوی میں ان دونوں طبقوں کو کلی تمکن حاصل ہوگیا۔ مسلم معاشرے میں اچانک نمودار ہوجانے والے یہ دو طبقات تھے:

۱۔حکمراں (Rulers)اور

۲۔علما(Ulama)

ان دونوں طبقات میں ہم آہنگی تھی۔ان کے مقاصد ایک تھے۔ چنانچہ ان کی باہمی معاونت نے دیکھتے دیکھتے مسلم معاشرے کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔معاشرے کی یہ تقسیم عمودی (Vertical) تھی۔ چنانچہ اس عمودی تقسیم (Vertical Division) نے مسلم معاشرے میں ایک مخصوص قسم کی ثنویت (Dichotomy) قائم کر دی جسے 'مسلم معاشرے کی عمودی ثنویت' (The Vertical Dichotomy) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس ثنویت (Dichotomy) کا باضابطہ آغاز 661 عیسوی میں ہوا۔اس حادثے کے نتیجے میں مسلم معاشرہ عملاً دو طبقوں (Regimes) میں منقسم ہو گیا:

۱۔حکمراں موجہ طبقہ (Ruler-Oriented Regime)

۲۔علما موجہ طبقہ (Ulama-Oriented Regime)

حکمراں موجہ طبقے (ROR) کی کمان 'حکمراں' کے ہاتھوں میں تھی جب کہ علما موجہ طبقے (UOR) کی کمان 'علما' کے ہاتھوں میں۔ 661 عیسوی سے یہ دونوں طبقات (حکمراں اور علما) باہم معاون رہے۔ محض اس لئے نہیں کہ دونوں کے مقاصد ایک تھے بلکہ اس سبب سے بھی کہ ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر ان دونوں کے اہداف پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ آنے والے دنوں میں اس معاونت کے ذریعہ اٹھائے گئے اقدامات نے مسلم معاشرے میں ایک اور تقسیم کی بنا ڈال دی۔ یہ دوسری تقسیم افقی (Horizontal) تھی۔اسے افقی دوہرے پن (Horizontal Dualism) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس تقسیم (Division) سے مسلم معاشرہ افقی (Horizontally) طور پر بھی دو مزید کیفیات میں منقسم ہو کر رہ گیا: یہ دو افقی کیفیات تھیں:

۱۔حکمراں موجہ طبقے کا دوہرا پن

Dualistic Phenomenon of Ruler-Oriented Regime(ROR)

۲۔علما موجہ طبقے کا دوہرا پن

Dualistic Phenomenon of the Ulama-Oriented Regime-(UOR)

چنانچہ ہر طبقہ مزید تلے اوپر دو حصوں یا خانوں (Chambers / Compartments) میں

منقسم ہوگیا۔ اوپری حصہ ابتدائی عہد میں کھلا خانہ (Open or Unconditioned Compartment) تھا۔ اس طبقے کے افراد کی تعداد بے حد محدود تھی۔ یہ اخص الخواص (Elite) تھے۔ اس کا نچلا حصہ بند خانہ (Closed Compartment) تھا۔ اس طبقے میں کثیر آبادی داخل تھی۔ یہ خانہ صد فی صد مکیف (Hundred Percent Conditioned) تھا۔ اس طرح کل ملا کر مسلم معاشرہ چار خانوں میں بنٹ چکا تھا یا بانٹ دیا گیا تھا۔ ان چار خانوں میں دو ثنوی (Dichotomic) تھے اور دو ترادفی (Dualistic)۔

۱۔ حکمراں موجہ طبقہ

حکمراں موجہ طبقہ
Ruler-Oriented Regime (ROR)

حکمراں موجہ طبقے کا کھلا خانہ
(Open / Unconditioned Compartment of ROR)

حکمراں موجہ طبقے کا صد فی صد مکیف خانہ
(Hundred Percent Conditioned Compartment of ROR)

۲۔ علما موجہ طبقہ:

علما موجہ طبقہ
Ulama-Oriented Regime (UOR)

علما موجہ طبقے کا کھلا خانہ
(Open / Unconditioned Compartment of UOR)

علما موجہ طبقے کا صد فی صد مکیف خانہ
(Hundred Percent Conditioned Compartment of UOR)
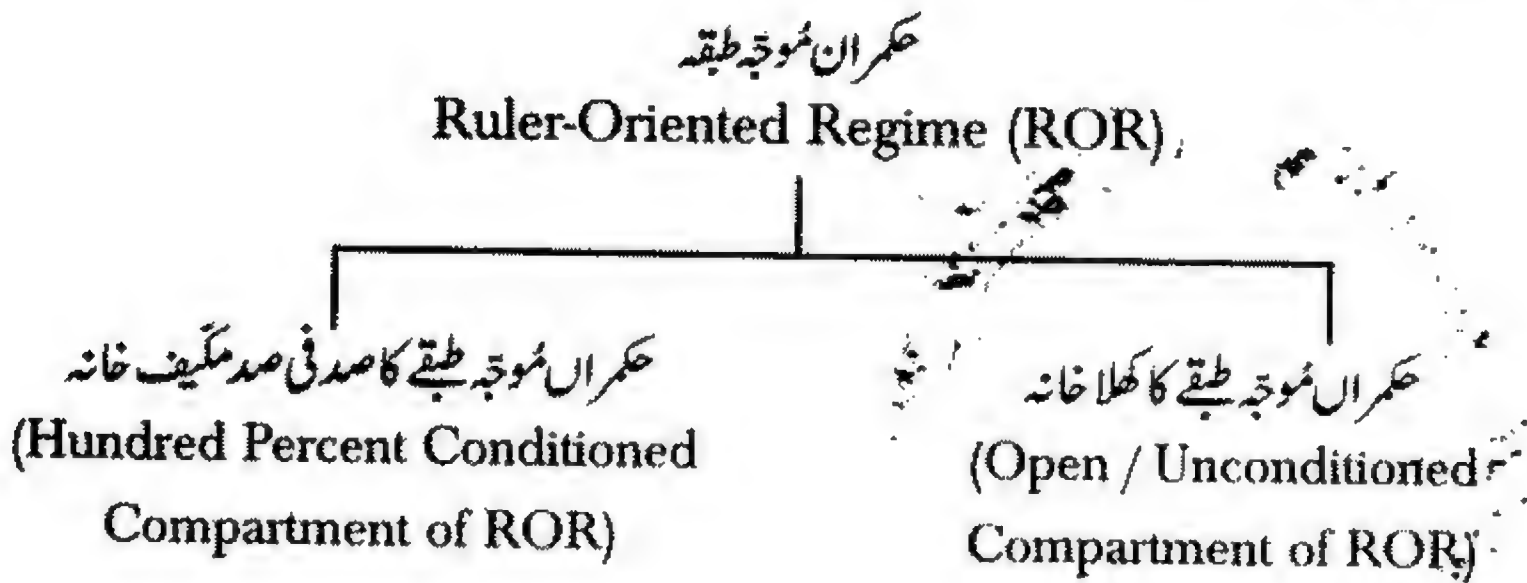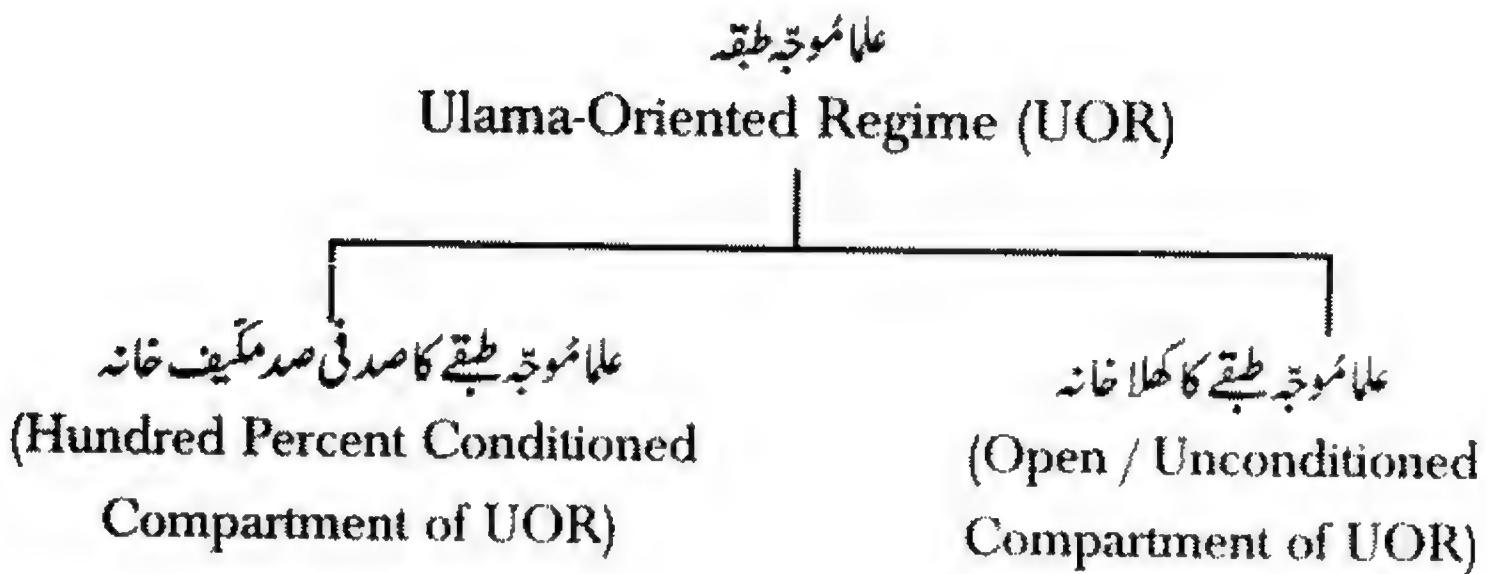
حکمراں موجہ طبقے (ROR) کے صد فی صد مکیف خانے (Hundred Percent Conditioned Compartment of ROR) میں کثیر آبادی ان طبقات کی تھی جو اگر چہ متوسط طبقے اور عوام سے ہی آتے تھے لیکن مخصوص احوال میں رہتے ہوئے وہ حکمرانوں کی دو اقسام کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ یہ دو اقسام کی خدمات (Services) تھیں:

۱۔عُمّالی خدمات(Administrative Services)
۲۔عسکری خدمات(Military Services)،

دوسری جانب علما مُوجہ طبقے (UOR) کے صدفی صد مکیف خانے (Hundred Percent Conditioned Compartment of UOR) میں بقیہ معاشرے کی کل عوامی آبادی داخل تھی جو بنیادی طور پر چھوٹے علما اور لاکھوں رکروڑوں عوام پر مشتمل تھا۔ گویا اس طرح 661 عیسوی کے بعد مسلم معاشرے میں حکمرانوں (Rulers) اور علما (Ulama) نے جارج اورویل کے اینی مل فارم (Animal Farm) سے مشابہ دو اینی مل فارمز قائم کر دیئے۔ صدفی صد مکیف (Hundred Percent Conditioned) یہ دو ذیلی افقی خانے (Horizontal Compartments) بنیادی طور پر ننادے فیصد امت مسلمہ پر مشتمل تھے۔ لیکن یہ دونوں صدفی صد مکیف خانے (H.P.C.C.) یکساں خانے نہیں تھے۔

ان میں اول الذکر یعنی حکمراں مُوجہ طبقے کا صدفی صد مکیف خانہ (H.P.C.C. of ROR) صرف از روئے حقیقت روبوٹی (Actually Robotic) تھا جب کہ ثانی الذکر یعنی علما مُوجہ طبقے کا صدفی صد مکیف خانہ (H.P.C.C. of UOR) از روئے قوت روبوٹی (Potentially Robotic) بھی بنادیا گیا تھا۔

چونکہ حکمراں مُوجہ طبقے کے صدفی صد مکیف خانے (H.P.C.C. of ROR) کے افراد یعنی (نچلے) عمال اور افواج بھی دراصل متوسط طبقے یا عوام سے ہی آتے تھے اور وہاں قائم اداروں (Institutions) کے تعلیم وتربیت یافتہ ہوتے تھے لہذا ہر چند کہ حکمراں مُوجہ طبقے کے صدفی صد مکیف خانے میں شامل ہو جانے کے سبب نسبتہً زیادہ مراعات (Privileges) اور مواقع (Opportunities) کے مستحق ہو جاتے تھے اس لئے از روئے حقیقت روبوٹی (Actually Robotic) ہونے کے باوجود وہ اپنے اندرون میں پہلے سے از روئے قوت بھی روبوٹی (Potentially Robotic) ہو چکے ہوتے تھے۔ لہذا ایسے افراد بہت جلد حکمرانوں کے لئے غیر مفید (Unuseful)، غیر پیداواری (Unproductive) حتی کہ بعض اوقات پیداوار مخالف (Counter Productive) ثابت ہونے لگے۔ اس طرح مسلم معاشرے کے چار حصوں میں سے حکمراں طبقے کے کھلے اور غیر مکیف خانے کو چھوڑ کر پوری امت مسلمہ از روئے قوت روبوٹی (Potentially Robotic) ہوگئی۔ امتِ مسلمہ کے ان تینوں طبقات کو صدفی صد مضمحل

(Degenerate) بنانے میں حکمرانوں (Rulers) اور 'علما' (Ulama) دونوں کا ہاتھ تھا جن میں 'علما' عاملِ حرکی (Active Factor) تھے جب کہ حکمراں ان کے پشتیبان۔ چودہ سو سالہ مسلم تاریخ کا مطالعہ اور تجزیہ بتاتے ہیں کہ حکمرانوں نے پوری امتِ مسلمہ کو مضمحل (Degenerate) کردینے کا کام 'علما' سے لیا۔ 'علما' نے حکمرانوں کے اشاروں پر اور ان کے تعاون سے پوری امتِ مسلمہ کو مضمحل (Degenerate) کرکے نیم انسانی یا حیوانی (Dehumanized) بنادینے کا سارا مشن 'نظامِ تعلیم' (Educational System) اور اس سے متعلق اداروں (Institutions) اور اس کے ادوات (Tools) کے ذریعہ پورا کیا۔ حکمرانوں نے اس مشن کو کامیابی سے پورا کرنے کے لئے حکمرانی کے فرائضِ منصبی سے اور اس کی بنیادی ذمہ داریوں سے عملاً دست بردار ہوکر 'علما' کو اس بات کی نہ صرف اجازت دی بلکہ عملاً علانیہ اور براہ راست ان کی بھرپور مدد کی تاکہ وہ مسلم معاشرے میں نظامِ تعلیم (Educational System) کا صدفی صد احتکار یا اس کی اجارہ داری (Monopoly) کرلیں۔ مسلم معاشرے میں نظامِ تعلیم پر 'علما' کی مکمل اجارہ داری صرف حکمرانوں کے دست بردار اور پشتیبان ہو جانے سے ہی ممکن ہوسکی۔ نہ صرف یہ کہ حکمرانوں نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہی اس کے سب سے بڑے پاسدار اور پشتیبان بنے رہے۔ چنانچہ 'مدرسہ' (Madresa) اور 'منبر' (Pulpit) میں 'علما' کی اجارہ داری (Monopoly) کو توڑ دینے کی کبھی اور کسی کو حکمرانوں نے اجازت نہیں دی۔ یہی وہ موقع تھا جب حکمرانوں (Rulers) اور علما (Ulama) نے باہمی تعاہد اور تعاون سے پوری امتِ مسلمہ کو عملاً غلام (Slave) بنالیا۔ تاریخ کا اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ جو قوم ساری دنیا کے انسانوں کو ہر طرح کی غلامی اور ظلم سے آزاد کرانے کے لئے برپا ہوئی تھی وہ خود سرتا پا غلام (Slave) بنادی گئی۔ جس قوم کا مقصدِ وجود فك رقبة (90:13) تھا اس کے اندر 'غلامی' (Slavery) کے باضابطہ اور قانونی ادارے قائم کردیئے گئے۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مولوی چراغ علی: مجموعہ روایات استرقاق واستائی: 1876: سیتاپور۔

۲۔ مولوی چراغ علی: تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام: بحوالہ رسائل چراغ علی مرتبہ مولوی عبداللہ خاں: کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد 1918۔

یہی وہ حادثۂ فاجعہ ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

۱۔ عن أبی امامه الباهلی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: لینقضن عراالاسلام عروة عروةً فکانما انتقضت عروة تشبثت الناس بالتی تلیها و اولهن نقضا الحکم و آخرهن الصلاة (مسند احمد ج ۵۔ مرویات ابوامامہ الباہلی)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ الباہلی نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام کے حلقے میں سے ایک ایک حلقہ ٹوٹتا جائے گا۔ تو جب ایک چیز ٹوٹے گی تو لوگ اس کی جگہ لینے والی چیز سے وابستہ ہو جائیں گے چنانچہ سب سے پہلے ٹوٹنے والی چیز 'الحکم' ہوگی اور سب سے آخری 'الصلاۃ'۔

۲۔ وعن عبدالله بن مسعود عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: تدور رحی الاسلام لخمس و ثلثین اوست وثلثین او سبع و ثلاثین فان یهلکوا فسبیل مَن هالك وان یقم لهم دینهم یقم لهم سبعین عاماً: قلتُ: امّمِا بقی او ممّا مضی؛ قال: مِمّا مضی۔ (رواه ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی چکی پینتیس اور چھتیس اور سینتیس سال چلتی رہے گی۔ اور ہلاک ہو گئے تو یہ ہلاک ہونے والے کا راستہ ہے۔ اور اگر یہ قائم رہے تو ان کا دین ستر سال ان کے لئے قائم رہے گا۔ میں نے پوچھا: باقی سے یا گزرے ہوئے سالوں سے؟ فرمایا: گزرے ہوئے سالوں سے۔

۳۔ وعن ابی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یتقارب الزمان و یقبض العلم و تظهر الفتن و یلقی الشح ویکثر الهرج. قالوا: وما الهرج؛ قال: القتل. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: زمانہ قریب ہو جائے گا۔ علم اٹھا لیا جائے گا۔ فتنے ظاہر ہوں گے۔ بخل ڈال دیا جائے گا۔ اور ہرج کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگوں نے پوچھا: ہرج کیا ہے؟ فرمایا: قتل۔

۴۔ وعن أبی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم هلکة امتی علی یدی غلمة من قریش. (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: میری امت کی ہلاکت

قریش کے غِلْمَہ کے ہاتھوں ہے۔

۵۔ وعن أبي هريرة ان النبي صلى الله عليه وسلم قال: ويل للعرب من شر قد اقترب۔ افلح من كف يده۔ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: خرابی عرب کے لئے! اس شر سے جو قریب آ گیا۔ نجات پا گیا! جس نے اپنا ہاتھ روکا۔

لیکن حکمرانوں (Rulers) کے لئے امتِ مسلمہ کا اینی مل فارم (Animal Farm) میں رہنا جتنا لازمی، ضروری اور مطلوب تھا اسی قدر لازمی، ضروری اور مطلوب ایسے افرادِ کار کی فراہمی تھی جو باصلاحیت ہوں اور حکمرانی کے تقاضوں کی تکمیل میں ان کی معاونت کر سکیں۔

حکمراں اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اینی مل فارم (Animal Farm) میں رہنے والے مضمحل (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanized) افراد حکمرانی میں ان کے مددگار اور معاون نہیں ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ حکمرانی سے امتِ مسلمہ کو عملاً اور قوۃً دور رکھنے کی یہی صورت حکمرانوں کو مناسب اور حسبِ حال لگی۔ چنانچہ حکمرانوں نے حکمرانی کے تقاضوں کی تکمیل دو متبادل صورتوں یا ذرائع سے کرنے کا فیصلہ کر لیا:

۱۔ باطنی خارجی اخذ (Covert Outsourcing) اور

۲۔ ظاہری خارجی اخذ (Overt Outsourcing)

خارجی اخذوں (Outsourcings) کی ان دونوں شکلوں اور صورتوں کا آغاز 661 میں پوری شدت اور تغلب کے ساتھ شروع ہو گیا۔ جہاں تک خفیہ خارجی اخذ (Secret Outsourcing) کی بات ہے تو اس کا سلسلہ تو اس سے کئی سالوں قبل سے ہی جاری تھا۔

چنانچہ خلفائے بنی امیہ (661-750) نے نظامِ حکومت کے تمام اہم شعبوں میں یہودیوں اور معدودے چند شعبوں میں عیسائیوں سے خارجی اخذ (Outsourcing) کئے۔

جہاں تک خلفائے بنی عباسیہ کی بات ہے تو انھوں نے ساری حد پار کر دی اور نظامِ حکومت کے تقریباً تمام ہی بنیادی شعبے کلیۃً یہودی Outsourcing کے حوالے کر دیئے۔ وزارتِ تعلیم، وزارتِ قانون سازی، وزارتِ انصاف وعدل، وزارتِ مالیات، وزارتِ محصول، وزارتِ زراعت، وزارتِ تجارت، وزارتِ عالمی تجارت، وزارتِ دارالضرب، وزارتِ خارجہ، وزارتِ تربیتِ عمال، وزارتِ

صرف مال صد فی صد یہودی خارجی اخذ (Outsourcing) کے حوالے تھے۔اسی تھوک خارجی اخذ (Wholesale Outsourcing) کا نتیجہ تھا کہ 780عیسوی آتے آتے امتِ مسلمہ کی حیات کے ہر شعبے میں یہودیوں کی کلی اجارہ داری(Monopoly & Monopsony) قائم ہوچکی تھی۔

چونکہ یہ خارجی اخذ بیک وقت باطنی اور ظاہری دونوں تھالہٰذا امتِ مسلمہ عملاً غلام ہوکر بدترین نظام استبداد کا شکار بن کر رہ گئی۔جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس خارجی اخذ (Outsourcing) کی دوصورتیں رائج کی گئیں:

ا۔باطنی خارجی اخذ(Covert Outsourcing)

۲۔ظاہری خارجی اخذ(Overt Outsourcing)

ظاہری خارجی اخذ ہر چند کہ بے حد خطرناک تھالیکن اس کی شناعت ظاہر اور خرابی قابلِ شناخت تھی۔لیکن سب سے زیادہ خطرناک نتائج کی حامل اور امتِ مسلمہ کے لئے حد درجہ مہلک خارجی اخذ کی صورت وہ تھی جسے باطنی خارجی اخذ(Covert Outsourcing) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس خارجی اخذ (Outsourcing) نے آنے والے دنوں میں امتِ مسلمہ کوگھن کی طرح اندر اندر کھالیا اور دیمک کی طرح چاٹ لیا۔یہی وہ خارجی اخذ ہے جس کے جدائل (Strands) کا پہچاننا تاریخ میں بہت آسان نہیں۔یہی وہ باطنی خارجی اخذ ہے جسے بدلتے زمانے میں تاریخ میں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے مثلاً موالی (Mawali)،مملوک (Mamluk)،غلام (Slave)،جان نثاری(Jannissari) وغیرہ۔عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباسیہ میں اس باطنی خارجی اخذ کو عموماً 'موالی'(Mawali) کہا جاتا تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

(۱) أبو الفرج اصفہانی: کتاب الأغانی. طبع مصر

(۲) البلاذری: فتوح البلدان. طبع مصر

(۳) ابن عبد ربه: العقد الفرید. طبع مصر

(۴) ابن خلدون: مقدمه ابن خلدون. دار القلم. بیروت

(۵) الجاحظ: کتاب البیان و التبیین

(۶) المسعودی: التنبیه والاشراف

(۷) قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج. طبع مصر

(۸) یحییٰ بن آدم: کتاب الخراج طبع لیدن

(۹) الحاکم نیسابوری: معرفة علوم الحدیث: ذکر نوع الثالث و الاربعین، طبع حیدر آباد

(۱۰) السمعانی: کتاب الأنساب، طبع حیدر آباد

(۱۱) السرخسی: شرح السیر الکبیر، طبع حیدر آباد

(۱۲) David Ayalon: Outsiders in the Lands of Islam: Mamluks, Mongols, and Eunuchs (London: 1988).

(۱۳) Fred.M. Donner: The Early Islamic Conquests: Princeton: Princeton University Press, 1981.

(۱۴) Daniel, Pipes: Slave-Soldiers and Islam: The Genesis of a Military System: New Haven, Yale University Press, 1981.

(۱۵) Norman A. Stillman: The Jews of Arab Lands: A History and Source Book, Philadelphia, 1979.

(۱۶) Marion Woolfson: Prophets in Babylon: Jews in the Arab World, London & Boston, 1980.

(۱۷) S.D. Goitein: Studies in Islamic History and Institutions, Leiden: Brill, 1966.

(۱۸) E.I.J. Rosenthal: Judaism And Islam: London, NY, 1961.

(۱۹) S.W. Baron: A Social and Religious History of the Jews; Vol-III-VIII, Philadelphia, 1957-58.

ان دونوں خارجی اخذوں کا نتیجہ امتِ مسلمہ کی حیویت (Vitality) اور معاشرت (Social Life) میں یہ برآمد ہوا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سو سال کے اندر اندر مسلمانوں کے سارے قوانین (Laws)، ضابطے (Rules)، ریگولیشنز (Regulations)، اسٹے چیوٹس (Statutes)، انتظامیہ کے سارے طریقے، عدلیہ کے سارے نارمس (Norms)، فوج کی ساری ترجیحات (Priorities)، وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ کی ساری پالیسیاں (Policies) اور سفارت کاری (Diplomacy) کے سارے پروٹوکولس (Protocols) قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق مرتب ہونے کی بجائے مشنی (Mishna) اور تلمود (Talmud) کے

مطابق مرتب ہوکر قرآن اور سنت کے نام سے نافذ العمل ہو گئے۔ یہودی احادیث (Oral Laws) پر مبنی یہی وہ قوانین ہیں جنھیں آج دنیا 'اسلامی فقہ' (Islamic Fiqh) کے نام سے جانتی ہے۔

۴۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ 661 عیسوی میں مستحکم ہونے والا 'حکمرانوں' اور 'علما' کا یہ تعاہد یکساں مقاصد اور اہداف رکھتا تھا اس لئے اس خارجی اخذ (Outsourcing) نے جلد ہی بے حد خطرناک صورت، سرعت اور شدت اختیار کرلی۔ اس خارجی اخذ کے ذریعہ درآمد کئے گئے افراد نے جو اپنی جگہ بڑے بڑے جہابذہ اور عباقرہ تھے اور اپنے عہد کی ہارورڈ (Harvard)، ییل (Yale) اور کولمبیا (Columbia) جیسی یونیورسٹیوں سے منسلک تھے قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسے خلاقانہ اصولیات اور قوانین (Innovative Principles & Laws) وضع کرنا شروع کردیئے جو بالآخر امتِ مسلمہ کو ہلاکت سے دوچار کردینے والے ثابت ہوئے۔

خود ساختہ اصولیات اور قوانین کے ایجاد سے قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے روئے ارض پر بسنے والے خلقِ خدا کو تقسیم کردیا گیا۔ روئے ارض اور عالم انسانیت کو تقسیم کرنے کا یہ عمل اسلام اور امتِ مسلمہ کے مقصدِ بعثت کے خلاف کی گئی بدترین کارروائی اور سازش تھی۔ یہ بدترین سازش تھی:

۱۔ روئے ارض اور اس پر بسنے والی انسانی آبادی کو 'دارالاسلام' اور 'دارالحرب' میں منقسم کردینا۔

یہ بات تصور میں بھی لائی نہیں جاسکتی کہ اللہ —— رب العالمین، قرآن —— ھدی للناس اور نبی آخر الزماں —— رحمۃ للعالمین کسی ایسی تقسیم کی کیوں کر اجازت دے سکتے ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ جو اسلام: 'الدین عند اللہ الاسلام' (3:19) ہو

۲۔ جو رسول: 'رحمۃ للعالمین' (21:107) اور 'وما ارسلناك كافة للناس بشيراً و نذيرا' (34:28) ہو

۳۔ جو امت: 'اخرجت للناس' (3:110) اور 'شهداء على الناس' (2:143) ہو —— اور

۴۔ جو قرآن: 'یایها الناس' (2:121/4:1) جیسے الفاظ سے خطاب کرتا ہو —— وہ ایسی تقسیم کی کیوں کر اجازت دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اسلام کی روح اور مقصدِ وجود کو کچل کر اور اس

کی علانیہ خلاف ورزی کر کے روئے ارض اور اس پر بسنے والی انسانی آبادی کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ انسانوں کے ان دونوں طبقوں کے مابین ہر سطح پر کلی مقاطعہ (Total Seperation)اور کلی عداوت (Total Enmity & Hostility) کی باضابطہ قانونی شکل قائم ہوگئی۔

صرف اتنا ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر روئے ارض پر ایک اور 'دارالحرب' کا قیام کیا گیا جواز حد چونکانے والا اور قرآن اور سنت رسول کی صریح خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ یہ 'دارالحرب'' 'دارالاسلام' کے اندر قائم کیا گیا۔ گویا روئے ارض پر دو 'دارالحرب' قائم کئے گئے ایک متحارب اور کلی مقطوع (Hostile & Totally Boycotted)اور دوسرا مامون اور کلی مربوط (Protected & Entirely Co-ordinated)۔

بے حد حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ پہلا 'دارالحرب' حقیقی سرحدوں (Actual Borders) کے ساتھ قائم کیا گیا جب کہ دوسرا 'دارالحرب' تعبیری سرحدوں (Virtual Borders) کے ساتھ۔ 'دارالاسلام' میں قائم کلی مامون اور کلی مربوط (Exclusively Protected & Entirely Co-ordinated) 'دارالحرب' تھا آبادی کے ایک حصے کا 'ذمی تسلیم کرلیا جانا'۔

اس ہمہ جہت (Across the Board) خارجی اخذ (Outsourcing) نے دو نتائج برآمد کئے:

۱۔ امتِ مسلمہ پر مسلط اور عارض طفیلیوں کا کلی تمکن قائم ہوجانا

(Unchallenged Total Domination of Parasites on the Ummah)

۲۔ امتِ مسلمہ کا کلی اضمحلال اور نیم انسان شدگی کا شکار ہوجانا

(Total Degeneration & Dehumanization of the Ummah)

۵۔ 661 عیسوی میں قائم ہونے والا حکمراں۔ علما تعہّد (Ruler-Ulama Nexus)اور اس کے تحت قائم ہو جانے والی عمودی ثنویت (Vertical Dichotomy)اور افقی ترادفیت (Horizontal Dualism) نے امتِ مسلمہ کو دیکھتے دیکھتے لاش میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔

اس انقلاب اور اس مفسدہ کے خلاف آوازیں اٹھیں۔ ظاہر ہے ایسی تمام آوازیں 'حکمرانوں' اور 'علما' کے لئے پیغامِ اجل لانے والی ہو سکتی تھیں لہذا جبر اور استبداد کا سہارا لیا گیا۔ ایسی تمام آوازوں اور ان کے عواقب کو دبانے کے لئے سخت اور وحشتناک کارروائیاں کی گئیں۔ بالآخر انھیں بزور کچل کر یا تو

کلیۃً ختم کر دیا گیا یا بے اثر اور محدود بنا کر حاشیہ نشیں (Marginalized) بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ مسلم معاشرے میں اس مفسدہ کے خلاف اٹھنے والی مختلف آوازوں میں تین طبقات کی آوازیں قابل ذکر ہیں:

ا۔ صحابہ وتابعین: اس حکمراں۔علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے خلاف بعض صحابہ اور ان کے بعد تابعین نے آواز اٹھائی چنانچہ مخالفت کرنے والے صحابہ کرام اور تابعین کو سختی سے کچل ڈالا گیا۔ (سنن نسائی۔ سنن ابوداؤد)

۲۔ اہل علم ودانش: اس کے خلاف معاشرے کے اہل علم ودانش نے بھی آواز اٹھائی۔ جن اہلِ علم ودانش نے اس حکمراں۔ علما تعہد کے خلاف آواز بلند کی انھیں ترہیب یا ترغیب اور بالآخر تعذیب کے ذریعہ حاشیہ نشیں (Marginalized) بنا کر بے اثر کر دیا گیا۔

۳۔ اہل تقوی اور اہل ورع: اہل تقوی اور اہل ورع نے عموماً 'تجنب' کا طریقہ اختیار کیا۔ بعد کی تاریخ میں امتِ مسلمہ میں اسی 'تجنب' کو تصوف کے 'گمراہ کن' نام سے پکارا جانے لگا۔ امتِ مسلمہ کے اہل تقوی اور اہل ورع کا یہ 'تجنب' بعینہ اسی طرح اور کم وبیش انھیں حالات میں ظاہر ہوا تھا جیسا 'نصرانیت' میں چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں 'صحرائی آبا' (Desert Fathers) کا ظہور ہوا تھا۔

حکمراں۔علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے ذریعہ قائم کی جانے والی عمودی ثنویت (Vertical Dichotomy) اور افقی ترادفیت (Horizontal Dualism) بے حد طاقت ور تھیں چنانچہ مخالفت میں اٹھنے والے تمام طبقات یا تو اپنی روح کے اعتبار سے معدوم ہو کر آنے والے زمانوں میں 'انفرادی بُروز' کی شکل میں ظاہر ہونے لگے یا پھر خود 'مقلوب' (Metamorphosed) ہو کر اسی تعہد (Nexus) کا حصہ بنتے چلے گئے۔ اس تعہد کے خلاف 'انفرادی بُروز' کا سلسلہ مسلم معاشرے میں کبھی ختم نہیں ہوا اور ہنوز جاری ہے۔ حکمراں علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے خلاف آواز بلند کرنا 'جرم عظیم' قرار پایا۔ 661 عیسوی کے بعد عبداللہ بن مبارک (738-798) نے اس صورتحال کا یوں اظہار کیا ہے:

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّينَ إِلاَّ الْمُلُوكُ   وَأَحْبَارُ   سَوْءٍ   وَرُهْبَانُهَا

جنھیں اس 'جرم عظیم' اور اس پر نازل ہونے والے عتاب کی تفصیلات جاننا ہو وہ

ا۔ اصفہانی (897:966) کی کتاب الأغانی

۲۔ جاحظ (775:868) کی کتاب الحیوان

۳۔ غزالی (ف ۱۱۱۱) کی احیاء العلوم

۴۔ عمر خیامؔ (ف ۱۱۲۳)، سعدیؔ (ف ۱۲۹۲)، حافظؔ (ف ۱۳۹۱) کی غزلیں ملاحظہ کر لیں۔

حافظؔ نے فرمایا:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مشکلی دارم زدانش مند محفل باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

گوئیا باور نمی دارند روز داوری کیں ہمہ قلب و دغا در کار داور می کنند

مزید فرمایا:

دی دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحری گفت بروز میکدۂ بادف و نی ترسای

گر مسلمانی این است کہ حافظؔ دارد وای گر درپس امروز بود فردای

ماحول کے جبر کا یہ احساس جب نا قابلِ برداشت ہو جاتا ہے تو حافظؔ پکار اٹھتے ہیں:

چو در دست ست رودی خوش بزن مطرب سرودی خوش کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم

یکی از کفری لافد دگر طامات می بافد بیا کیں داوری ہارا بہ پیش داور اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

۶۔ طویل مدت (Long Term) میں امتِ مسلمہ کی طبع اور ذہن پر حکمراں۔علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے دو جانبہ اثرات مرتب ہوئے:

ا۔ جانبِ اول: حکمراں۔علما تعہد دراصل امت مُوجّہ (Ummah Oriented) تھا اس لئے اس کے اصلی اہداف امتِ مسلمہ سے متعلق تھے۔ چنانچہ ان اہداف کے حصول میں یہ تعہد پوری طرح کامیاب ہوا۔ امتِ مسلمہ صد فی صد مکیف (Conditioned) ہو کر مضمحل (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanized) ہو گئی۔

جانبِ آخر: لیکن یہ بھی ایک تاریخی ستم ظریفی (Irony) ہے کہ ایسے کسی بھی اقدام کا جانبِ آخر یعنی حکمراں۔علما تعہد کے اصل عاملین (Factors) یعنی حکمرانوں اور علما پر بھی اثر پڑا۔ وہ طویل مدت

میں اس ثنویت اور ترادفیت کے اثرات سے اچھوتے نہیں رہ سکے۔

طویل مدت میں حکمراں اور علما بھی بالآخر امتِ مسلمہ کو محیط تکییف (Conditioning) کے شکار ہوکر رہے۔ پہلے مرحلے میں حکمرانوں اور علما کی 'عمودی ثنویت' کے اندر موجود 'افقی ترادفیت' کے نچلے خانے کے افراد یعنی:

ا۔ حکمراں مُوجِبہ طبقے کا صدفی صد مکیف خانہ (Hundred Percent Conditioned Compartment of ROR)—— پھر دوسرے مرحلے میں——

۲۔ علما مُوجِبہ طبقے کا صد فی صد مکیف خانہ (Hundred Percent Conditioned Compartment of UOR) اور —— بالآخر تیسرے مرحلے —— میں علما مُوجِبہ طبقے کا کھلا خانہ (Open / Unconditioned Compartment of UOR) اس تکییف (Conditioning) کا شکار ہوکر رہے۔ مسلم تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تینوں طبقات آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں باضابط اور بالاکثر مکیف (Conditioned) ہو چکے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے آج تک مسلسل یہ تکییف (Conditioning) گہری اور سخت تر ہوتی جارہی ہے۔

۲۔ 1250 عیسوی آتے آتے حکمرانوں کا اوپری طبقہ (Open / Unconditioned Compartment of ROR) صدفی صد مکیف (Conditioned) ہو چکا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہی یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ یہ تکییف (Conditioning) اب ہمہ گیر اور ناقابلِ شکست ہو چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس 'تکییف (Conditioning) کا انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ ابعاد (Dimensions) یعنی:

ا۔ کیفیاتی (Qualitative)

۲۔ تعبیری (Virtual)

۳۔ حقیقی (Actual) اور

۴۔ قوتی (Potential)

پر غلبۂ تامہ ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ امتِ مسلمہ میں حکمراں۔ علما تعہّد قائم تھا اور اس اعتبار سے حکمرانوں اور علما کا معاشرے پر غلبہ بھی برقرار تھا لیکن فی الواقع کیفیاتی، تعبیری، حقیقی اور قوتی طور پر وہ امتِ مسلمہ کے بقیہ لوگوں کی طرح ہی مکیف ہو چکے تھے۔ ان کا وجود صرف ایک اعتبار سے قائم تھا یعنی

وجودی (Existentially) طور پر وہ 'موجود' تھے۔ یہ مسحورانہ صورتحال اٹھارہویں صدی عیسوی میں اچانک مغربیوں کے غلبے سے پاش پاش ہوگئی۔ امت میں اب تک صدیوں سے غالب چلے آرہے—— حکمرانوں کا 'وجود' ختم (Evaporate / Vanish) ہوگیا۔ ادھر حقیقی صورتحال یہ تھی کہ 1600 عیسوی میں امتِ مسلمہ کے چاروں خانے یعنی 'عمودی ثنویت' اور 'افقی ترادفیت' کا Matrix صد فی صد مضمحل (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanised) تھا۔

۳۔ تکییف (Conditioning) ایک کیفیت ہے۔ اس کا احساس صرف انھیں ہوتا ہے جنھوں نے 'تکییف' سے ماورا فضا کا مشاہدہ یا تجربہ کیا ہو یا اس کا علمی وفکری ادراک کیا ہو۔ طویل عرصے تک مکیف رہ کر امت نہ صرف ایسے کسی ادراک سے محروم ہوگئی تھی بلکہ اس کی قوتِ مدرکہ بھی اب ایسے ادراک کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ 661 سے 1700 تک دو ایسے اسباب رہے جنھوں نے مسلم معاشرے میں اس ادراک کے نہ ہونے کے ادراک کو بھی کامیابی سے روکے رکھا۔ یہ دو اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ حکمرانوں کا قائم کردہ نظامِ خارجی اخذ (Outsourcing) حکمرانوں کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری تندہی سے ادا کر رہا تھا۔ ان عناصر کے لئے کوتاہی کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ تفویض کردہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کو ہر اعتبار سے آسان بنانے کے لئے حکمراں۔ علما تعہد نے اسے 'ناقابل تسخیر مامن' (Impregnable Sanctuary) فراہم کردیا تھا۔ یہ ناقابلِ تسخیر مامن تھا 'دارالاسلام کے اندر قائم' کیا جانے والا 'Virtual' ذمیوں کا دارالکفر'۔

یہ وہ 'دارالکفر' تھا جسے خود 'فقہا' نے 'دارالاسلام' کے اندر اپنے ہاتھوں سے قائم کیا تھا۔ چونکہ یہ 'دارالکفر' حقیقی (Actual) نہیں بلکہ تعبیری (Virtual) تھا اس لئے گویا اس کے حدود 'دارالاسلام' کے برابر تھے۔ بالفاظ دیگر 'فقہا' نے دارالاسلام کو شرعاً دارالکفر میں تبدیل کردیا تھا۔

۲۔ دوسرا سبب جیو پالیٹیکل (Geopolitical) تھا۔ گزشتہ چار ہزار سالوں سے نظامِ عالم 'ارض نہاد' (Land-Based) تھا۔ اس 'ارض نہاد' نظام کو 1700 عیسوی تک کسی حقیقی خطرہ (Actual Threat) کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

یہی وہ دو اسباب تھے جن کے سبب امتِ مسلمہ تکییف (Conditioning) کے ادراک کے نہ ہونے کے ادراک سے بھی عاری رہی۔

۴۔ 1700 سے بوجوہ واضح طور پر 'ارض نہاد' نظامِ عالم (Land-Based World) بدل کر رہ

گیا۔ یہی وہ گھڑی تھی جب مسلم حکمرانوں اور علما کو اپنے مکیف (Conditioned) ہونے کا پہلا احساس ہوا۔ یہ پہلا جھٹکا (Shock) تھا۔ جب انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو انھیں ایک اور ادراک کے نہ ہونے کا ادراک ہوا۔ انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ 'اسلام' دین اللہ جسے وہ اب تک اپنی اساس سمجھ رہے تھے اور جس کے حوالے سے اس تکییف (Conditioning) کو مرغوب و مقبول بنا دیا گیا تھا اس کی حقیقی سمجھ کی قوت سے وہ محروم ہیں۔ یہ دوسرا جھٹکا نا قابلِ یقین تھا۔ پہلی بار 1700 عیسوی میں 'حکمرانوں' اور 'علما' کے 'اَخص الخواص' کو ادراک ہوا کہ:

۱۔ وہ 'قرآنی تناظرِ علمی' سے کلیۃً نابلد ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ——

۲۔ وہ 'انسانی تناظرِ علمی' سے بھی کلیۃً نابلد ہیں۔

چنانچہ انھیں پہلی بار ادراک ہوا کہ ان دونوں 'تناظرِ علمی' سے کلی ناواقفیت نے انھیں صدیوں سے نام نہاد 'دارالاسلام' کے خول میں مقید کر دیا تھا۔ اس 'کیفیاتی زندان' میں رہتے رہتے وہ فکری، علمی، معلوماتی، تجرباتی اور تقابلی علم اور صلاحیت سے ہر اعتبار سے کلی طور پر عاری ہو چکے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ ایک ہزار سالوں میں در آنے والے روحانی، علمی اور اخلاقی انحطاط نے انھیں سیلِ بے پناہ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ اس 'خطۂ انسانی' کی جوان کے 'فقہا' کے قائم کردہ دارالاسلام سے ماورا ہے —— کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ گزشتہ ایک ہزار سال سے دارالاسلام سے ماوراوہ خطۂ 'انسانی' کن احوال سے گزرتا رہا ہے؟ وہاں فکری، علمی اور تجرباتی کیا کیا انقلابات آئے ہیں؟ اس خطۂ انسانی نے ذہنی ارتقا کا کیسا سفر کیا ہے؟ ان کی موجودہ مسائی، مشاغل، حرکات اور تحرکات کیا ہیں؟ ان کی تحریکات اور ان کے تحرکات کے اہداف کیا ہیں؟ اس 'خطۂ انسانی' میں افرادی، ادارہ جاتی، علومی اور نظریاتی کیسی استعداد پیدا ہو چکی ہے؟ وہاں اچھے اور برے افراد اور ان کی اجتماعیات کیا کیا عزائم رکھتے ہیں؟ —— غرض وہ ان تمام باتوں سے پوری طرح ناواقف تھے۔

امتِ مسلمہ میں صدیوں سے غالب چلے آ رہے حکمران اور علما اس بات سے صد فی صد نابلد تھے کہ ان کے دارالاسلام سے باہر بقیہ 'خطۂ انسانی' بالخصوص مغرب (West) میں کیا ہوتا رہا تھا۔ 1453، 1514، 1559، 1648 اور اس کے بعد (1846,1814, 1788, 1715) کے انقلابات اور ان کے مُضمرات نے کیا عَواقِب مرتب کئے ہیں جن سے عن قریب پوری دنیا بشمول ان کا 'دارالاسلام' تہہ و بالا ہو جانے والی ہے۔ وہ ان تمام باتوں سے بالکل نابلد تھے۔ چنانچہ جب 'دارالاسلام' سے ماوراوہ 'خطۂ انسانی' متحرک ہوا اور اپنے اہداف کے حصول کے لئے اس نے اپنے افرادِ کار، علوم، مشاہدات، تجربات،

معلومات اوران کے ادوات (Tools) اور Terminators کو برسرِعمل (Activate) کیا تو مسلم حکمراں اور علما 'ریت کی دیوار' کی طرح ڈھ کر رہ گئے۔

۷۔ مسلم حکمرانوں اور علما کے انہدام کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ:

۱۔ علم (Knowledge) سے عاری تھے۔

۲۔ معلومات (Information) سے عاری تھے۔

۳۔ افرادی قوت (Skilled Human Resource) سے عاری تھے۔

۴۔ علمی انظباط (Knowledge Discipline) سے عاری تھے۔

۵۔ علمی، تجرباتی اور تربیتی ادارہ (Institution) سے عاری تھے۔

۶۔ تجربہ (Experience) سے عاری تھے۔

۷۔ مہارت (Experties) سے عاری تھے۔

۸۔ استعداد (Preparedness) سے عاری تھے۔

۹۔ منصوبہ (Planning) سے عاری تھے۔

۱۰۔ ہدف (Target) سے عاری تھے۔

چنانچہ مسلم حکمراں اور علما آناً فاناً ڈھ کر رہ گئے۔

نئی صورتحال کے عارض ہوجانے کے بعد مسلم حکمرانوں اور علما نے یکساں ردِعمل اور رویے کا اظہار کیا۔ یعنی کچھوے کی طرح سمٹ کر اپنے خول میں زیادہ مضبوطی سے بند ہوگئے۔ لیکن حوادث کا سیلاب بڑھتا جارہا تھا۔ چنانچہ جلد ہی ان دونوں طبقات ۔۔ 'حکمرانوں' اور 'علما' کے مابین فرق واقع ہونے لگا اور پہلی بار یہ تعہد (Nexus) ٹوٹنے لگا۔ اس کے کچھ اسباب تھے۔ حکمرانوں اور علما کے 'قالب' میں فرق تھا۔ چنانچہ دونوں کے حجم (Girth) میں بھی فرق واقع ہوا۔ انیسویں صدی آتے آتے عالم اسلام کے 'عظیم حکمراں' (Great Rulers) معدوم ہوچکے تھے۔ متوسط حکمراں یعنی امرا (Aristocrates) اور عمال (Bureaucrates) اب حکمرانوں کی جگہ لے چکے تھے۔ ان حکمرانوں کا حجم (Girth) نہایت کم تھا۔ اس کے برخلاف 'علما' کا حجم (Girth) عوام سے مربوط ہونے کے سبب بڑا تھا۔

حجم (Girth) کے فرق نے دونوں کو بالآخر جدا کردیا۔ جس طرح ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں ان دونوں طبقوں کے درمیان قائم ہونے والا 'تعہد' سرتاسر خودغرضانہ تھا اسی طرح اٹھارویں صدی

عیسوی میں ان میں جدائی بھی سرتاسر خود غرضانہ تھی۔ مسلم حکمراں طبقے نے چھوٹے حجم کے سبب عوام سے بالکلیہ انقطاع کر کے نئے حکمرانوں کے زیرِ سایہ پناہ لینے میں عافیت سمجھی۔

مسلم حکمرانوں کی نئے حکمرانوں کے زیر سایہ پناہ لینے کی یہ صورتحال معاصرانہ تھی نہ مفاہمانہ اور نہ ہمسرانہ۔ یہ پرعزم بھی نہیں تھی۔ یہ ایک سوچا سمجھا اور اپنے حالات پر غور کر کے پورے شعور کے ساتھ لیا گیا فیصلہ تھا۔ ایسا کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ فیصلہ عین ان کی نفسیات اور ان کے تحت شعور کے مطابق تھا۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ اب صرف غلامانہ، کاسہ لیسانہ، زلہ ربایانہ اور اُلش نصیبانہ رویہ ہی ان کے اہداف پورے کروا سکتا ہے۔ صدیوں کی تکییف (Conditioning) نے نہ صرف ان کے اعضا اور جوارح کو مفلوج اور معطل کر دیا تھا بلکہ ان کی نفسیات بھی مکیف (Conditioned) ہو چکی تھی۔ انھیں اپنی ذمہ داریاں بالخصوص تاریخی اور منصبی ذمہ داریاں ادا کرنی چاہیے تھی۔ اگر تکییف (Conditioning) نے ان کی طبع کو معطل و مفلوج نہ کر دیا ہوتا تو انھیں اپنی ان ذمہ داریوں کا ادراک ہو جاتا۔ ان کی اولین ذمہ داری تھی کہ 1600 عیسوی کے بعد بالعموم اور 1707 کے بعد بالخصوص اور بدرجۂ آخر 1803 کے بعد نئے افکار کے منابع اور نئے افکار سے مزوّد قوتوں کے مراکزِ ثقل رقوت (Power Centres) میں اپنی موجودگی کو یقینی اور موثر بناتے۔ ظاہر ہے ایسی موجودگی درج ذیل اہداف رکھتی:

۱۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کے ذخیرۂ علم و معلومات تک رسائی کے لئے موجودگی۔

(Presence for the outreach to the knowledge of the Emerging Ideas and Forces)

۲۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کے معاشرے کے Core تک رسائی کے لئے موجودگی۔

(Presence for the outreach to the Core of the Society of the Emerging Ideas and Forces)

۳۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کے علوم، ادارہ جات اور ادوات کو Overtake یا Outpace کرنے کے لئے رسائی۔

(Outreach for outpacing / overtaking the knowledge, Institutions and Tools of the Emerging Ideas & Forces)

۴۔ حاصل ہونے والے علوم، معلومات، تجربات، تاثرات اور مضمرات کو مخزون کرنے کے لئے Vernaculars میں درآمد۔

(Import of the acquired knowledge, Informations, Experiences, Impressions and Implications to be deposited in the Vernacular Medium)

۵۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کو Outsource کرنا۔

(To outsource the Emerging Ideas & Forces)

Outsourcing ایک دودھاری تلوار ہے۔ بیدار قوم کے لئے استحکام کا بہترین ذریعہ اور غافل یا نااہل کے لئے خودکشی۔

ان مسلم حکمرانوں کے پاس ایسے وسائل تھے کہ وہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اپنے اعزہ کو روم (Rome)، وینس (Venice)، ملان (Milan)، آکسفرڈ (Oxford)، کیمبرج (Cambridge)، ایڈنبرا (Edinburg)، شوبون، پیرس (Sorbonne Paris)، اسٹراس برک (Strasbourg)، برلن (Berlin)، لاپزش (Leipzig)، کوٹنجن (Gottingen)، ٹوبن جن (Tubingen)، گیٹے برک (Goteborg)، اپ سلہ (Uppsala)، زائرش (Zurich)، لوزاں (Lausanne)، باسل (Basel)، بوخارسٹ (Bucharest)، ویینا (Vienna)، پراگ (Prague)، مانسٹر (Münster)، ہم برک (Hamburg)، اتریخت (Utrecht)، ایمسٹرڈم (Amsterdam) اور لائڈن (Leiden) بھیج کر اعلیٰ افرادی قوت (High Grade Human Resource) پیدا کروا سکتے تھے۔ عاجز کے علم کی حد تک 'نئے حکمراں' بھی اس میں قطعاً مزاحم نہیں تھے۔ اور اگر ہوتے تو کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ بات بظاہر ان کے حق میں جارہی تھی لیکن انھوں نے ایسے افرادِکار (Work Force) پیدا کرنے کی باضابطہ اور منصوبہ بند کوئی جدوجہد نہیں کی۔

دوسری جانب مسلم 'علما' نے دوسری ترکیب اختیار کی۔ انہوں نے خود کو اور عوام الناس کی جتنی بڑی تعداد کو وہ متاثر کر سکتے تھے انھیں اس کی ترغیب دی کے ماحول سے کلی انقطاع کرتے ہوئے مزید تنگ خول میں سمٹ جایا جائے۔

۸۔ مسلم حکمران اور علما اپنی مذکورہ خصوصیات کی بنا پر ادراک کے باوجود تین عارضوں میں مبتلا ہو کر

رہ گئے۔ یہ تینوں 'عارضے' دراصل عارضہ سے زیادہ ان کی 'طبع' کے عکاس یا ان کا ردعمل تھے۔

۱۔ وہ 'بصیرت' سے خالی (Visionless) تھے۔

۲۔ وہ 'خلاّقیت' سے خالی (Uninnovative / Innovation Less) تھے۔

۳۔ وہ 'پہل' سے خالی (Initiativeless) تھے۔

دونوں کی طبع دفاعی (Defensive)، رجعی (Regressive) اور خود غرضانہ (Selfish) تھی۔ ایسی طبع فرد اور اس پر مشتمل اجتماعیت کو بے بصیرت، غیر خلاق اور بے اقدام بنا کر رکھ دیتی ہے۔

نامردی و مردی قدمی فاصلہ دارد

چنانچہ احوال واقعی کے فرق نے دونوں طبقات کو یکساں 'طبع' کے باوجود الگ الگ صورتوں میں اپنے مفادات کے حصول کی راہ دکھلائی۔ حکمرانوں نے نئے حکمرانوں کے سائے میں پناہ لے لی اور 'علما' عوام کے مابین 'قلعہ بند' ہو گئے۔

۹۔ 661 عیسوی سے قائم تکلیف (Conditioning) امت میں اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ مسلم تاریخ میں بعض مسلم حکمرانوں نے اگر خیر خواہانہ، اضطراراً یا ضرورۃً بھی اس خارجی اخذ (Outsourcing) کا خاتمہ کرنا یا اسے محدود (Limited) یا مسدود (Restricted) کرنا چاہا تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خارجی اخذ (Outsourcing) کے انسداد میں ان قوتوں کا غلبۂ تامہ اور اکثر خود امتِ مسلمہ کی عدمِ صلاحیت واستعداد جو اس تکلیف کا لازمی نتیجہ تھیں مانع آئے۔ مسلم تاریخ میں ایسی جسارت کرنے والے حکمرانوں کو معطل یا معزول کر دیا گیا یا ہلاک۔ بعض اوقات انھیں اس کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اس حوالے سے عہدِ قریب میں سلطنت مغلیہ میں اکبر سرفہرست ہے۔ جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کی مختلف وزارتوں حتی کہ ضلعی سطح تک جاری خارجی اخذ (Outsourcing) کے حوالے سے Innovations, Deviations, Machinations, Manipulations, اور Initiatives اور اس کے مضرات وعواقب اس بات کے غماز ہیں کہ مسلم معاشرہ صدیوں کے حکمراں۔ علما تعہد کے ذریعہ کس درجہ مضمحل (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanized) بنا کر رکھ دیا گیا تھا۔ یہ صورتحال کس درجہ راسخ تھی کہ ایسے ایسے عظیم اور اولوالعزم دوربین اور بیدار مغز حکمرانوں میں بھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ مسلم معاشرے میں فوری اور یکسر تبدیلی لا سکیں۔

صبحِ نخست

ا۔ امت مسلمہ پر طاری 'ثنویت' اور 'تَرٰاُدُفِیّت' کی وہ 'ظاہرات' جو 1700 عیسوی سے قائم ہیں 'معاصر سبب' کہلاتی ہیں۔ اس سبب کے عاملِ حقیقی (Actual Factor) 'علما' ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب جنوبی ایشیا میں سلطنت مغلیہ کے 'عظیم حکمراں' ختم (Vanish) ہو چکے تھے۔ متوسط اور چھوٹے امرا (Aristocrates) اور عمال (Bureaucrates) ہی اب اس عامل کے نمائندہ بچے تھے۔ حکمرانوں کے ان مابقیہ نمائندوں کا عوام سے کوئی حقیقی ربط نہیں رہ گیا تھا۔ عوامی ربط کے عنوان سے جو بھی ربط تھا وہ یک طرفہ (One-Sided) اور حاکمانہ (Arbitrary) تھا۔ یوں بھی امتِ مسلمہ میں (سلطنت مغلیہ کے عظیم حکمرانوں کو چھوڑ کر) حکمرانوں کی کوئی فکری، علمی، تجرباتی، تربیتی اور ادارہ جاتی وراثت نہیں تھی۔ صدیوں پہلے وہ اس کے نصف حصے سے خارجی عناصر کو Outsourced کر کے دست بردار ہو گئے تھے اور بقیہ حصے سے علما کو اجارہ داری (Monopoly) عطا کر کے دست بردار ہو گئے۔ لے دے کر باقی رہ جانے والے متوسط اور چھوٹے حکمرانوں کی ساری وراثت ان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں اور دولت تھی جن کی حفاظت کے حوالے سے انھیں عوام سے مربوط ہونے یا رہنے کی اب (اٹھارہویں صدی میں) چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات خود ان کی 'طبع' تھی۔ وہ صدیوں سے جا و بے جا طور پر عوام سے اس طرح غیر مربوط رہتے آئے تھے کہ ان کی 'طبع' ایسے کسی ربط کا ابا کرنے والی بن کر رہ گئی

تھی۔ نبیؑ امی(The Prophet of the Masses) کی امت جوامتِ وسط(The Regulator of The Mankind)اور شھداء علی الناس(The Witnesses on the Mankind) کی ذمہ داریوں کے ساتھ برپا کی گئی تھی تاکہ انسانوں کو ہر طرح کی غلامی(Salvery)، افلاس(Poverty) محرومی(Deprivation)اور استحصال(Exploitation) سے آزاد کرائے اور روئے ارض پر عدل (Justice) کے قیام کو یقینی بنائے اس کے حکمراں زمین پر ظلم(Injustice) کے دوستونوں میں سے ایک ستون بن کر رہ گئے تھے۔ جس امت کا مقصدِ وجود(Raison d'etre) تھا: فك رقبةٍ- اواطعٰم فی يومٍ ذی مسغبةٍ۔ يتيماً ذا مقربة۔ او مسكيناً ذا متربة۔ ثم كان من الذين آمنو او تواصو بالمرحمة- (90:13-17)

وہ امت خود' حکمراں۔ علما تعہدؑ کے ذریعہ صد فی صد مکیف بن کر رہ گئی تھی۔ ایسی حالت میں حکمرانوں کے ان مابقیہ کو عوام سے مربوط ہونے یا رہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اب ان کے مفادات کی حفاظت صرف اور صرف معاصر حکمرانوں سے وابستہ ہو کر اور انھیں کی رضا سے ہو سکتی تھی۔

۲۔1600 عیسوی سے عصرِ حاضر تک کی مدت کو اس حوالے سے دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

۱۔1600-1765

۲۔1765-1858

زمانے کے یہ دو فیصلہ کن مرحلے درحقیقت دو قطعے (Segments) ہیں۔ ان دونوں عرصوں کے دوران 'علما' نے ـــــ جن کی 'نظامِ تعلیم' پر مکمل اجارہ داری(Total Monopoly) صدیوں سے قائم تھی ـــــ ایک ایسے رویئے (Behaviour) کا اظہار کیا جو بلاشبہ انسانیت کے خلاف 'جرمِ عظیم' (Great Crime Against Humanity) کہلانے کا مستحق ہے۔ اس 'جرمِ عظیم' کا عنوان ہے:

''احوال و ظروف کے بدلتے منظر نامے میں امتِ مسلمہ کو منجمد رکھنا''۔

'منجمد رکھنے' کا جرم چار 'مظالم' کے ارتکاب سے عبارت ہے۔ یہ چار جرائم دراصل مظالم کا ایک مجمع (Matrix) ہے۔

۱۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ 'قرآنی تناظرِ علمی' فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کرا دینے کی کسی کو اجازت دینا۔

۲۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ 'انسانی تناظرِ علمی' فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کرا دینے کی کسی کو اجازت دینا۔

۳۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ 'ارتقائی اسلامی تعلیمی نظام' فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کرا دینے کی کسی کو

اجازت دینا۔

۴۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ 'تحقیقی اور تعبیری نصاب' فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کرا دینے کی کسی کو اجازت دینا۔

''احوال و ظروف کے بدلتے منظر نامے میں امت مسلمہ کو منجمد رکھنے'' کا 'جرم عظیم' 'علما' نے دو مرحلوں میں انجام دیا:

۱۔ مرحلۂ اول: 1600-1765

۲۔ مرحلۂ دوم: 1765-1858

پہلا مرحلہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب عالمی سطح پر Great Tectonic Power Shift واقع ہو رہا تھا اور نظامِ عالم (World Order) 'ارض نہاد' (Land-Based) رہنے کی بجائے 'بحر نہاد' (Ocean-Based) ہونے لگا تھا جس کے اثرات، مضمرات اور عواقب پوری دنیا بشمول ہندوستان پر مرتب ہوتے جا رہے تھے۔ جب کہ دوسرا مرحلہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب عالمی سطح پر Great Tectonic Power Shift نے حتمی اور حقیقی شکل لے لی تھی اور ہندوستان میں مغلیہ حکمرانوں کو مجبور ہو کر کارہای حکمرانی ان 'بحر نہاد' (Ocean-Based) قوتوں کو عملاً Outsourced کر دینی پڑی۔ مذکورہ ہر دو عہد میں 'علما' نے اپنے مکیف تعلیمی، مذہبی اور معاشرتی نظام کو صد فی صد مکیف (Hundred Percent Conditioned) رکھنے پر اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ ماحول میں طوفانی رفتار سے واقع ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود وہ بالکل پتھر بن گئے اور اپنے زیر اثر پورے مسلم معاشرے کو ان تبدیلیوں کے سامنے عملاً آنکھ موند لینے اور پتھر بن جانے کی ترغیب، تحریص اور ترھیب دی۔ عالم واقعہ میں پے در پے تبدیلیاں ہو رہی تھیں لیکن یہ ''زمین جنبد نہ جنبد گل محمد'' کے مصداق بن گئے۔ یہ 'علما' حقائق سے منہ موڑ رہے تھے ایسا نہیں تھا۔ انہیں حقائق کا علم تھا۔ 'علما' حقائق سے بے خبر کیسے ہو سکتے تھے؟ یہ کھلی آنکھوں سے ان تبدیلیوں کو دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ 'علما' کے 'رویئے' کی اصلی حقیقت تب واضح ہوئی جب انھوں نے اعلانیہ پتھر بن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ 'علما' دراصل 'سنت اللہ' کے خلاف اعلان جنگ کر چکے تھے۔ وہ 'سنت اللہ' کے اس اصول کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے جس میں کہا گیا تھا:

وتلك الايام نداولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰)

ترجمہ: اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔
'علما' اللہ کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ 'سنت اللہ' کے تحت لائی جانے والی ہر تبدیلی کو عالمِ واقعہ میں ہونے والی تبدیلی ماننے اور اس کی روشنی میں اپنا احتساب کرنے سے انھوں نے صاف صاف انکار کر دیا۔ بلاشبہ اس 'جرم عظیم' اور اس کے تحت روا رکھے جانے والے 'چار مظالم' کے ارتکاب کی جڑ تھی وہ روایتی اور موروثی ذہنیت جو 661 عیسوی سے امت پر عارض تھی جس کے تحت امت 'عمودی ثنویت' اور 'افقی ترادفیت' کا شکار چلی آئی تھی۔

۳۔ کوئی قوم کسی نظام جبر کے سائے میں، صدفی صد مکیف حالت میں صدیاں گزار کر بھی وجود کے اعتبار سے خالص اور بے آمیز زندہ رہ سکتی ہے، خواہ ایسی صورت میں اس کی تمدنی حیات اور اس میں پائے جانے والے معاشرتی ادارے صفحۂ ہستی سے مٹ کر ہی کیوں نہ رہ جائیں لیکن کوئی قوم 'ذہنی ثنویت' اور 'معاشرتی ترادفیت' کے ساتھ غیر مکیف حالت میں اپنے تشخص کو مجروح یا متاثر کیے بغیر چوتھائی صدی بھی گزارلے ممکن نہیں۔

1765 عیسوی سے برصغیر میں واقع ہونے والی تبدیلیاں 'احوال وظروف' کی حقیقی تبدیلیاں تھیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا منظر نامہ عالم تصور میں اور صورتِ متخیلہ میں متبدل نہیں تھا بلکہ برسرزمین اور علی رؤس الأشہاد متبدل تھا۔ اب تک مسلمانوں کے فکری، علمی، تجرباتی اور معلوماتی ماخذ (Source Materials)، ان کا تعلیمی وتربیتی نظام، اس کے تمام متعلقہ ادارے، ان اداروں میں رائج فکری، علمی، تدریسی، تعلیمی اور تدریبی نصاب، طریقۂ تعلیم اور ان کی اخلاقیات اور ان کے اہداف صدفی صد اور بغیر کسی ادنی مداخلت کے مکمل طور پر 'علما' کے ہاتھوں میں تھے۔

یہی 'تعلیمی نظام' اب تک معاشرے کی جملہ ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کو پورا کرتا تھا۔ یہی 'تعلیمی نظام' مسلم معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اہداف اور رخ متعین کرتا تھا۔ یہی 'تعلیمی نظام' مسلم معاشرے کی جملہ ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کی تکمیل کرنے والے افراد اور طبقات کے مطمحِ نظر (Vision) کو متعین، موجہ اور مقدر کرتا تھا۔

چنانچہ ''متبدل احوال وظروف'' اور ان کی حقیقت اور ناقابلِ صرفِ نظر ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کی فراہمی کی اولین اور مکمل ذمہ داری اسی 'نظام تعلیم' اور اس کے ذمہ داران کی تھی۔ یہ ذمہ داری 'علما' اور ان کے کلی Monopolized 'تعلیمی نظام' کی تھی کہ وہ معاشرے کے متبدل احوال وظروف کی

ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کی تکمیل کی استعداد رکھنے والی افرادی قوت (Workforce) فراہم کرتے۔ یہ ذمہ داری 'علما' کی تھی کہ وہ برسرزمین واقع ہونے والے احوال وظروف کا ادراک کرنے اور ان کی حقیقی اور برسرزمین ضرورتوں کی تکمیل کرنے کے لئے افرادی قوت (خصوصی، متوسط اور عمومی) کی فراہمی کرتے۔ وہ اخلاقی طور پر اپنی ان ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے۔ 661 عیسوی سے حکمراں۔علما تعہد کے نتیجے میں 'تعلیمی نظام' کی اجارہ داری (Monopoly) ان کے ہاتھوں میں آ گئی تھی جسے حکمرانوں نے اپنے خصوصی مفادات کے پیش نظر سند جواز عطا کیا تھا۔ اگر برسرزمین 'احوال وظروف' بدل گئے تھے اور نئی ضرورتیں، نئے تقاضے اور نئے مطالبات سامنے آ گئے تھے جب بھی یہ ذمہ داری سرتا سر 'علما' اور ان کے 'تعلیمی نظام' کی تھی کہ وہ نئے احوال اور ان کے مطالبات کو Accomodate کرتے۔ اگر اس Accomodation کے دوران وہ محسوس کرتے کہ بڑی تبدیلیوں یا انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے تو اپنے علمی افق (Intellectual Horizon)، تعلیمی نظام اور تعلیمی، تدریسی اور تدریبی اداروں کے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں ضروری (Required)، کافی (Adequate) اور خلاقانہ (Innovative) تبدیلیاں کرتے۔

۴۔ 1765 میں بالخصوص انگریزوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے کاندھوں پر بنگالہ جیسے وسیع وعریض صوبے کے نظم ونسق کی برسرزمین حقیقی اور دشوار ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ مغربی بالخصوص برطانوی تاریخ کا عمیق مطالعہ رکھنے والے کسی بھی فرد کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اتنی 'عظیم اور دشوار ذمہ داری' سلطنت مغلیہ نے انھیں کیسے دے دی؟ اور اس سے بھی زیادہ ناقابل فہم یہ بات ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اتنی عظیم اور دشوار ذمہ داری اپنے کاندھوں پر کیسے لے لی؟ لیکن ان دونوں باتوں سے بھی زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ نے اپنے چارٹر (Charter) کی اتنی بڑی خلاف ورزی کیسے نظر انداز کر دی؟ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ذمہ داروں نے انھیں لاعلم اور دھوکے میں رکھا۔ ان تمام ناقابل فہم باتوں کی اساس یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی یا اس عہد کی کوئی بھی یوروپی قوت خواہ وہ فرانسیسی ہوں، ڈچ ہوں یا پرتگالی اس کی استعداد رکھتے ہی نہیں تھے کہ وہ اتنا بڑا انتظام سنبھال لیں۔ سلطنت مغلیہ کے پاس جتنے انتظامی Constraints تھے ان سے کئی گنا زیادہ Constraints سے خود ان ملکوں کو سامنا تھا۔ رہی ایسٹ انڈیا کمپنی تو وہ سلطنت بھی کب تھی؟ ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کا صد فیصد مکیف معاشرہ (Hundred Percent Conditioned Society)

مکمل لاعلمی میں کام کر رہا تھا۔ یا پھر 'علما' کے ہاتھوں میں Monopolized 'نظامِ تعلیم' نئے احوال میں سلطنت مغلیہ کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے سے بالکل قاصر ہو چکا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے بادشاہان ذہن رسا تھے۔ بلند فکری اور آفاقی وسعت نظری میں انسانی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس کے عظیم المرتبت حکمرانوں کی بات جانے دیجئے ان کا سب سے کمزور اور بے بس بادشاہ بھی اپنی بلند فکری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی عظیم الشان سلطنت کیوں کر تباہ ہوگئی؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ سلطنت مغلیہ کو 'علما' نے تباہ کر دیا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر 'علما' نے سلطنتِ مغلیہ کو کیسے تباہ کر دیا؟ اس کا جواب ہے: 'علما' کی نظر میں سلطنت مغلیہ نے تین نا قابل معافی جرم کئے تھے۔ یہ تین جرائم تھے:

۱۔ امت کو صدیوں کی تکییف (Conditioning) سے نجات دلوانے کی کوشش کرنا۔

۲۔ امتِ مسلمہ کی امتِ وسط کی حیثیت کو بحال کرنے کی کوشش کرنا۔

۳۔ امتِ وسط اور شھداء علی الناس کی بحالی کے ذریعہ بنی نوع آدم کے لئے غلامی سے نجات کی راہ ہموار کرنا۔

۵۔ بادشاہانِ مغلیہ تاریخ میں سکندر اعظم کے بعد وہ پہلے مثالی حکمراں تھے جنھوں نے نظام حکومت کی چھوٹی سے چھوٹی معاملت کو شفاف (Transparent) اور جوابدہ (Accountable) بنانا چاہا۔ اس لئے سلطنت مغلیہ دنیا کی تاریخ میں پہلی عظیم الشان ایسی حکومت ہے جسے حقیقی معنوں میں 'مضبوط نظام حکومت' (Government of Records) کہلانے کا استحقاق حاصل ہے۔ سلطنت مغلیہ ملک میں ایسا ہی شفاف اور جوابدہ نظام نافذ کرنا چاہتی تھی۔ ایسے نظام کے لئے حکومت کو ہر شعبے میں انتہائی لائق و فائق اہل کار درکار ہوتے۔ یہی وہ مطالبہ تھا جس کے سامنے 'علما' پہاڑ کی طرح مزاحم ہو گئے۔ اس مطالبے کی تکمیل مسلم معاشرے کو تکییف (Conditioning) کی قید سے آزادی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ 'علما' اس کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔ وہ ایسے اہل کار تیار کرنے کے لئے نظام تعلیم میں ذرہ برابر بھی تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔

۶۔ سلطنت مغلیہ کا ہندوستان میں قیام ایک معجزہ تھا۔ یہ ربانی مداخلت تھی۔ انسانوں کو ہر طرح کے 'ظلم' اور 'غلامی' سے آزادی دلانے کی یہ ایک عظیم پیش رفت تھی۔ ایسی منضبط سلطنت پہلی بار وجود میں آئی تھی۔ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ بھی حیرتناک اور انسانی فلاح (Human Welfare) کے حوالے سے

حادثۂ عظیم (Great Disaster) تھا۔

۷۔ ہندوستان میں جب سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اسے ہر چہار طرف سے گونا گوں خطرات (Dangers) اور تحدیات (Threats) کا سامنا رہا۔ لیکن تاریخ کا تجزیہ بتاتا ہے کہ سلطنت کو سب سے بڑا خطرہ ہمیشہ 'علما' اور 'مشائخ' سے رہا۔ یہ عنوان اب بھی از حد گہرائی سے غیر جانبدارانہ تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ تاریخ کا یہ ایک حیرتناک معمہ (Paradox) ہے: 'علما' اور 'مشائخ' ہر باشعور مسلم حکومت کو تباہ کر دینے کے درپے کیوں رہے؟ ہر باشعور حکومت سے ان کی کشمکش کیوں واقع ہوئی؟ اس پیٹرن کا تفحص چند باتوں کو نمایاں کرتا ہے:

۱۔ حکومت اور 'علما' اور 'مشائخ' ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔

۲۔ حکومت اور 'علما' اور 'مشائخ' کے درمیان گونا گوں نوعیتوں کی کشمکش برابر جاری رہی۔

۳۔ حکومت اور 'علما' اور 'مشائخ' کے مابین تعلق ہمیشہ تناسبی (Proportionate) رہا۔ حکومت مضبوط ہوئی تو 'علما' اور 'مشائخ' سے تصادم میں شدت آ گئی۔ حکومت کمزور ہوگئی تو علما اور مشائخ سے تصادم میں کمی آ گئی۔ کمزور ترین ادوار میں 'علما' اور 'مشائخ' بہت مضبوط اور با اثر ہو گئے۔ کمزور ترین ادوار میں مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی (تاریخ مشائخ چشت، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات وغیرہ) کا تجزیہ تاریخی اصولوں کے برخلاف ہے۔ ان کی تحقیق کی پہلی اینٹ ہی غیر جانبدارانہ اور محققانہ نہیں۔ فرانسس روبنسن (Francis Robinson) نے پہلی بار اس جانب تحقیق کی جس کے تتبع میں گیل منالٹ (Gail Minault) اور باربرا مٹکاف (B.D. Metcalf) نے تحقیق جاری رکھی۔ عاجز کو امید قوی ہے کہ آندرے ونک (Andre Wink) کی الہند کی تیسری جلد اگر آئی تو اس میں کچھ مزید پیش رفت ہوگی۔ تاہم عاجز کو اندیشہ ہے کہ مغربی محققین اس عنوان پر تحقیق کا بوجوہ حق ادا نہ کر سکیں۔

سلطنت مغلیہ کو اپنے قیام کے پہلے دن سے 'علما' اور 'مشائخ' کی مخالفت کا زبردست سامنا رہا۔ سلطنت مغلیہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ذریعہ قائم ہونے والی سب سے پہلی اور بڑی منضبط اور محفوظ (Well Disciplined & Recorded) حکومت تھی۔ حیرتناک امر یہ ہے کہ حکومت سے 'علما' اور 'مشائخ' کی کشمکش کا یہی دور نقطۂ عروج بھی ثابت ہوا۔ سلطنت مغلیہ انسانی تاریخ میں پہلی مثالی (Ideal)، عملی (Pragmatic)، بے انتہا روادار (Extremely Accomodative)، عوامی

(Popular) اور دانش ورانہ (Intellectual) حکومت تھی۔ اس کے بادشاہان اعلیٰ ترین اوصاف کا نمونہ تھے۔ دنیا کی تاریخ میں اتنے وسیع وعریض مخلوط معاشرے (Pluralistic Society) میں قائم حکومت کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ عصر حاضر کی نام نہاد جمہوری حکومتیں بھی ان اصولوں پر اب تک کھری اتر نہ سکیں اور نہ اتنی طویل مدت تک کامیاب رہیں۔ تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ آخر ایسی مثالی، عملی، روادار، عوامی اور دانش ورانہ حکومت سے 'علما' اور 'مشائخ' کا تصادم نقطۂ عروج پر کیوں پہنچ گیا۔؟ [ہر چند کہ پروفیسر سید اطہر عباس رضوی نے یہ نکتہ اٹھا کر حبیب الرحمن خان شروانی، مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور زیڈ اے فاروقی کے نقطہ ھای نظر پیش کر دیئے ہیں لیکن وہ اس گتھی کو پھر بھی سلجھا نہ سکے۔]

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ S.A.A. Rizvi: Muslim Revivalist Movements In Northern India in the Sixteenth & Seventeenth Century: Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi: (1995 Edition).

۲۔ مناظر احسن گیلانی: ہزارۂ دوم یا الف ثانی: تذکرۂ مجدد الف ثانی، لکھنؤ۔

۳۔ Dr. I.H. Qureshi: Introduction to "A History of the Freedom Movement.

۴۔ Dr. Riazul Islam: Symptoms of Decline: A History of the Freedom Movement.

۵۔ Z.A. Farooqui: Aurangzeb And His Times: Bombay, 1935.

لہٰذا ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن تحریکوں کو مؤرخین 'احیا کی تحریکیں' (Revivalist Movements) قرار دے رہے ہیں وہ اسلام کی احیا کی تحریکیں تھیں یا اس کے انہدام کی تحریکیں (Exterminatory Movements)؟

۸۔ سلطنت مغلیہ چونکہ عدیم النظیر مثالی، عملی، روادار، عوامی اور دانش ورانہ حکومت تھی اس لئے ڈھائی سو سال برقرار رہ گئی اور چونکہ اس کی پالیساں مبنی برحقیقت اور ہمہ گیر انسانی فلاح کے لئے برسرِ عمل تھیں اس لئے ان کے بعد آنے والی حکومتوں کے پاس ان 'بنیادی اصولوں' کو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گزشتہ پونے دو سو سالوں میں برصغیر میں صرف انھیں

موقعوں پر تباہیاں آئیں جب جب سلطنت مغلیہ کی قائم کردہ ان 'بنیادی پالیسیوں' کی صریح خلاف ورزی کی گئی خواہ تفکیر کی سطح پر یا تدبیر کی سطح پر یا پھر تعمیل کی سطح پر۔

۹۔ سلطنت مغلیہ کو اپنے قیام کے پہلے دن سے تین Threats کا سامنا رہا۔ پہلا: اندورنی، دوسرا: ملکی اور تیسرا: خارجی۔ ان تینوں خطرناک Threats میں سب سے خطرناک اور مہلک Threat اندرونی تھا۔ سلطنت مغلیہ کو درپیش یہ اندرونی خطرہ کیا تھا؟ سلطنت مغلیہ کو یہ اندرونی Threat تھا 'علما' اور 'مشائخ' کا 'Threat'۔

اس Threat کی تین سطحیں اور دو محاذ تھے۔ یہ تین سطحیں تھیں:

۱۔ اشرافیہ

۲۔ علما اور

۳۔ مشائخ۔

دو محاذ تھے:

۱۔ علما کی تحریکات اور

۲۔ مشائخ کی تحریکات۔

تین سطح: Threat کی تین سطح سے مراد تین سطحوں میں Moles اور Fifth Columnists کا Implantation اور ان کے خیالات کی معاشرے میں Embedding کا Threat۔

پہلی سطح: مسلم معاشرہ بالخصوص اس کی اشرافیہ میں Moles اور Fifth Columnists کا Implantation۔ اسلام اور امت مسلمہ مخالف ایک خارجی، مضر اور مہلک عنصر تھا جو اشرافیہ میں منصوبہ بند طریقے اور رفتار سے Implant کیا جا رہا تھا۔ عام طور پر یہ 'ادخال' مسلمانوں کے ان طبقات میں کیا جاتا تھا جو بعض وجوہ سے معاشرے میں باعزت اور مراعات یافتہ تھے۔ ان طبقات میں چار قابل ذکر ہیں:

۱۔ سادات

۲۔ صدیقی

۳۔ فاروقی اور

۴۔ عثمانی۔

چنانچہ یہ خارجی عنصر مسلم معاشرے میں سادات، صدیقی، فاروقی اور عثمانی کی شکل میں تیزی سے داخل ہوکر بارسوخ ہورہے تھے۔

دوسری سطح: پھر اسی طبقے کے افراد جو معاشرے میں بحیثیت سادات، صدیقی، فاروقی اور عثمانی معروف اور بااثر ہوچکے ہوتے تھے 'علما' کے اعتبار سے ظاہر ہوکر الگ الگ نوعیتوں کی 'تحریکات' کا آغاز کرتے تھے۔ مساجد، مدارس، منبر اور علوم کے ذریعہ ان تحریکوں کو معاشرے میں بارسوخ بناتے تھے۔

تیسری سطح: معاشرے کا یہی طبقہ جو بحیثیت سادات، صدیقی، فاروقی اور عثمانی معروف اور بااثر ہوچکے ہوتے تھے 'روحانی' اعتبار سے ظاہر ہوکر الگ الگ نوعیتوں کی 'روحانی تحریکات' کا آغاز کرتے تھے۔ عہد سلطنت میں یہ خارجی مشائخ عام طور پر چشتیہ میں داخل ہوئے اور عہد مغلیہ میں نقشبندیہ میں۔ ظاہر ہے ان تینوں سطحوں —— اشرافیہ، علما اور مشائخ میں معروف اور بارسوخ ہوجانے والا یہ طبقہ نہ تو اصلاً سادات تھا نہ صدیقی، نہ فاروقی اور نہ عثمانی۔

دومحاذ: ان تین سطحوں کے علاوہ دو محاذ تھے۔

۱۔ علما اور ان کی تحریکات کا محاذ

۲۔ مشائخ اور ان کی تحریکات کا محاذ۔

۱۰۔ سلطنت مغلیہ کو اول روز سے اس عظیم Threat کا سامنا تھا۔ یہ Threat مقامی تھا اور نہ سادہ بلکہ عالمی تھا اور پیچیدہ۔ یہی وجہ ہے کہ جب پروفیسر خلیق احمد نظامی اور پروفیسر سید اطہر عباس رضوی جیسے مؤقر تاریخ دانوں نے بھی Exclusive اور Insular ہوکر بابرنامہ، تزک بابری، اکبرنامہ، آئین اکبری، تزک جہانگیری، رقعات عالمگیری، احکام عالمگیری، دستور العمل اور کلمات طیبات پڑھے تو ان کے رموز، غوامض اور مقاصد ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ جب یہ حضرات بدایونی، بایزید بیات اور نظام الدین کی عبارتوں کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں تو پھر انسانی تاریخ کے اس عدیم النظیر سلطنت کے ان 'عظیم حکمرانوں' (The Great Mughals) کے اپنے قلم سے لکھی عبارتوں کو نہ سمجھ سکے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔ یہ حکمراں جوامع الکلم تھے۔ ان کی عبارتیں مختصر مگر اپنے اندر جہانِ معنی رکھتی تھیں۔ مثلاً جب ایک حکمراں اپنے پیش رو کے لئے کوئی لقب استعمال کرتا تھا تو اس کے اندر پنہاں معانی اور پیغامات کا سمجھنا بڑے سے بڑے زبان داں کے لئے آسان نہ تھا۔ کیا مغلیہ حکمراں اپنے پیش رووں کے لئے 'عرش آشیانی'، 'جنت مکانی' اور 'خلد مکانی' جیسے القاب تحریر کرتے تو اس کا سمجھنا اتنا آسان ہے! ایسا نہیں بلکہ یہی عبارت

جہانگیر استعمال کرے تو کچھ اور معانی ہوں گے، شاہجہاں کرے تو کچھ اور اور عالمگیر کرے تو کچھ اور معانی۔

داخل ہونے والے یہ 'علما' 'سنی' بھی تھے اور 'شیعی' بھی۔ یہ 'ادخال' (Implantation) اور 'ترسیخ' (Embedding) منصوبہ بند طریقے سے سنیوں میں بھی ہو رہا تھا اور شیعوں میں بھی۔ بلکہ ان میں بعض حسب ضرورت سنی سے شیعی ہو جاتے تھے تو کبھی شیعی سے سنی۔

علما کی طرح روحانی مشائخ سنی بھی تھے اور شیعی بھی۔ معاشرے میں 'مشائخ' کا 'ادخال' (Implantation) اور ان کی 'ترسیخ' (Embedding) بحیثیت سنی بھی ہو رہا تھا اور بحیثیت شیعی بھی۔

'علما' اور 'مشائخ' میں ان طبقوں کا ظہور حیرتناک تھا جو اس راہ سے داخل ہو کر سلطنت کو مسلسل متزلزل اور مسلم معاشرے کو فساد آلودہ کر رہے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ مقامی اور ملکی نہیں تھے بلکہ ان کی جڑیں عالمی تھیں۔ یہ بیک وقت عالم اسلام کی دو عظیم سلطنتوں میں سرگرم تھے۔ 'سلطنت عثمانیہ' جہاں خلافت قائم تھی اور 'سلطنت مغلیہ' جو دوسری سب سے بڑی حکومت اور پہلی کی پشتیبان تھی۔ مغلیہ حکمراں عثمانی خلفا سے زیادہ بیدار مغز تھے۔ اس لئے سلطنت مغلیہ کو منہدم کئے بغیر خلافت عثمانیہ کو منہدم کرنا ممکن نہ تھا۔ مغلیہ حکمراں زیادہ بیدار مغز اور ذہین تھے۔ لہٰذا ان قوتوں کے خلاف انہوں نے عثمانی حکمرانوں سے زیادہ کامیاب کارروائیاں کیں جب کہ سلطنت مغلیہ سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں زیادہ غیر مستحکم زمین پر کھڑی تھی۔ سلطنت عثمانیہ میں یہ علما اور مشائخ زیادہ رسوخ پا گئے اور قانونی شکل اختیار کر لی جب کہ سلطنت مغلیہ کے عظیم حکمرانوں نے انھیں کبھی مستحکم ہونے نہیں دیا۔

ملاحظہ فرمائیں:

Marshall G.S. Hodgson: The Venture of Islam: III, The Gunpowder Empires and Modern Times: Chicago: 1974.

۱۱۔ سلطنت مغلیہ اور علما اور مشائخ کے تصادم کے پانچ ادوار ہوئے۔

۱۔ پہلا دور : 1526-1587

۲۔ دوسرا دور : 1587-1656

۳۔ تیسرا دور : 1656-1713

۴۔ چوتھا دور : 1713-1803

۵۔ پانچواں دور 1803-1857

ان تمام ادوار میں 'علما' اور 'مشائخ' نے سلطنت مغلیہ کو اکھاڑ پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان واقعات کے نقوش اب بھی نمایاں ہیں چنانچہ سلطنت مغلیہ کے عظیم حکمرانوں نے چند مخصوص الفاظ کا استعمال کبھی عمومی اور کبھی خصوصی معنوں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن جب جب انہوں نے ان الفاظ کا استعمال خصوصی معنوں میں کیا ان کی مراد یہی 'علما' اور 'مشائخ' رہے تھے۔ ان خصوصی الفاظ میں دو قابل ذکر ہیں: (۱) خانہ برانداز سلطنت اور (۲) کافران نعمت۔ جہانگیر نے ایک اور لفظ کا استعمال کیا ہے وہ لفظ ہے 'شیاذ'۔ ایسے 'علما' اور 'مشائخ' نے عہد مغلیہ میں دو جگہ مراکز قائم کئے۔ عہد اول یعنی 1526-1650 آگرہ میں اور عہد دوم یعنی 1650-1858 دہلی میں۔ مذکورہ پانچ ادوار میں سلطنت مغلیہ نے 'علما' اور 'مشائخ' کے Threat سے نبٹنے کے لئے تین عظیم الشان پالیسیاں وضع کیں۔

پہلی پالیسی: پہلی پالیسی بابر نے وضع کی۔ اس کا دور 1526-1556 تھا۔

دوسری پالیسی: دوسری پالیسی کے دو ادوار ہیں اولاً تجرباتی دور 1556-1587 اور دوسرا دوسری پالیسی کے باضابطہ نفاذ کا دور 1587-1656۔ اس پالیسی کو وضع کرنے والا اکبر تھا۔

تیسری پالیسی: تیسری پالیسی کو وضع کرنے والا عالمگیر تھا اور اس کا دور 1656-1713 تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ : بابرنامہ
۲۔ ابوالفضل علامی : آئین اکبری
۳۔ ابوالفضل علامی : اکبرنامہ
۴۔ عبدالقادر بداؤنی : منتخب التواریخ
۵۔ : دستور العمل آگہی
۶۔ شاہ نواز خاں خوافی : مآثر الامراء
۷۔ غلام حسین خان طباطبائی : سیر المتاخرین

۱۲۔ حبیب الرحمن خان شروانی نے ایک سوال اٹھایا ہے۔ مناظر احسن گیلانی اس کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''احسان فراموشی ہوگی، اگر میں اس کا اظہار نہ کروں کہ سب سے پہلے اس مسئلہ کی طرف جس کا

میں آج ذکر کرنا چاہتا ہوں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مدظلہ العالی سابق صدر الصدور ممالک محروسہ آصفیہ نے توجہ دلائی تھی آپ نے ایک تقریر میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا وجہ تھی کہ مغل حکومت کے تخت پر چار بادشاہ مسلسل ایسے بیٹھے کہ ان میں دو پہلوں کو دو پچھلوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نواب علامہ کا اشارہ اس طرف تھا کہ شاہجہاں اور عالمگیر ان دو پچھلوں کو جہانگیر اور اکبر سے مقابلہ کر کے دیکھیے۔ دونوں میں کوئی مناسبت ہے؟ یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ ان چاروں میں کون سے دو آسمان تھے اور کون زمین۔ لیکن نسبت دونوں طبقوں میں وہی تھی جو آسمان و زمین میں ہوسکتی ہے۔ آخر بجائی گندم کے گندم سے جو کی روئیدگی کس طرح ہوگی۔ وہی دریا جو شاہنشاہی قوتوں کے ساتھ ایک سمت بہہ رہا تھا یکا یک پلٹ کر اس کا بہاؤ بالکل مخالف رخ کی طرف کن اسباب کے تحت ہو گیا۔''

[ملاحظہ فرمائیں: گیلانی: تذکرۂ مجدد الف ثانی، لکھنؤ، 1959 محولہ رضوی]۔

یہ اظہار خیال تاریخ کے بالعموم اور سلطنت مغلیہ کی تاریخ کے بالخصوص یکسر غلط فہم اور غلط تعبیر (Total Misreading) کا نتیجہ ہے۔ لیکن آگے جانے سے قبل ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے:

آخر بعض انگریز مؤرخین (برطانوی شاہی مؤرخین نہیں) اور 'علما' اور 'مشائخ' کے مابین عہد مغلیہ کے حوالے سے عبد القادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ کی پسندیدگی میں اس قدر ہم آہنگی کیوں ہے؟

سلطنت مغلیہ کی تینوں پالیسیوں — بابری پالیسی، اکبری پالیسی اور عالمگیری پالیسی میں تفکیری کوئی فرق نہیں بلکہ جو کچھ فرق واقع ہوا وہ تدبیری یا تعمیلی فرق ہے۔ یہ سمجھنا کہ فلاں آسمان ہے اور فلاں زمین سراسر سوئے فہم کا نتیجہ ہے۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

۱۳۔ بلاشبہ یہاں ایک امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علما اور مشائخ کے تعلق سے سلطنت مغلیہ کی پالیسی کا غائر مطالعہ عاجز کو اسی نتیجے تک لے جاتا ہے کہ سلطنت کی علما اور مشائخ کے تعلق سے بابری، اکبری اور عالمگیری پالیسی میں تفکیر کی سطح پر کوئی فرق یا انحراف (Deviation) پایا نہیں جاتا۔ جو کچھ فرق نظر آتا ہے اور ہے، وہ تدبیر اور تعمیل کی سطح کا فرق ہے۔ تاہم تدبیر یا تعمیل کی سطح پر تبدیلی بعض خارجی عوامل سے مل کر جداگانہ نتائج برآمد کرنے کا باعث ضرور ہوئی۔ بابری پالیسی اصلاً عالمی پالیسی تھی۔ ہندوستان کی سطح پر سب سے کامیاب اکبری پالیسی تھی جس نے حکومت کو استحکام بخشا۔ ملکی سطح پر سب سے ناکام عالمگیری پالیسی ثابت ہوئی۔ تاہم عالمگیری پالیسی کا تجربہ غیر معمولی تجربہ ہے۔ عالمگیری پالیسی کے تجربے کے نتائج بتاتے ہیں کہ تدبیر یا تعمیل کی سطح پر حتی کہ وقتی طور پر بھی یہ پالیسی از حد Counter-

Productive ثابت ہوتی ہے۔ عالمگیر کے تجربے کے باوجود حیرت ہے کہ ضیاء الحق (1924-88) نے یہ پالیسی اختیار کی۔ ضیاء الحق عالمگیر کی طرح وسیع المطالعہ اور ذہین تھے نہ ان کے پاس اتنی اخلاقی طاقت تھی جتنی عالمگیر کو میسر تھی۔ عالمگیر کے نزدیک اس مسئلے کی دقیق باریکیاں زیادہ واضح تھیں۔ وہ اس کے Chemical Bonds اور Vectorisation کے Facts اور Data کا زیادہ بڑا ذخیرہ رکھتے تھے جن کا عشر عشیر بھی دوسروں کو میسر نہیں۔ ضیاء الحق کے اقدامات آئندہ سو سالوں تک امت کو کس قیامت صغریٰ سے دوچار کریں گے اس کے تصور سے ہول آتا ہے۔

سلطنت مغلیہ کا زوال ایک دردناک حادثہ اور Mischance ہے۔ بلاشبہ اس سلطنت کا خاتمہ مغربی قوتوں نے نہیں کیا۔ تاریخ کا دقیق جائزہ بتاتا ہے کہ مغربی قوتیں اسے قطعاً ڈھانے کی حالت میں نہیں تھیں۔ وہ اگر ان کو ڈھاتیں تو ان کی بنیادی پالیسیوں کو وارث کی طرح نہ ڈھوتیں اور نہ سلطنت مغلیہ سے اصول حکمرانی میں کسب فیض کرتیں۔ سلطنت برطانیہ پورا ادراک رکھتی تھی کہ سلطنت مغلیہ کیا معنی رکھتی ہے۔ یہی وہ ادراک ہے جس کا اظہار ان دو دستاویزات سے ہوتا ہے۔ یہ دو دستاویزات ہیں:

ا۔ 1858 میں ہندوستان کی سلطنت کی ذمہ داریاں لینے کی قانون سازی کی دستاویز: اس دستاویز میں سلطنت برطانیہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے ملک فتح کرلیا ہے۔ اس نے برطانوی پارلمان میں یہ قانون پاس کیا کہ ہم اب ان ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر لیتے ہیں جو اب تک ایسٹ انڈیا کمپنی ادا کرتی تھی اور اس کا مقصد نظم و نسق کو درست کرنا ہے۔ چنانچہ 75 دفعات پر مشتمل یہ ایکٹ جس کا نام تھا: "Act For the Better Government of India 1858"۔

۲۔ یکم نومبر 1858 کا وہ اعلان جو ہندوستان کے طول و عرض میں ملکہ برطانیہ وکٹوریہ کی جانب سے کیا گیا۔ جس کا عنوان ہے:

"Proclamation By The Queen in Council To The Princes, Chiefs, And the People of India."

۱۴۔ بلاشبہ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ اسلامی، انسانی اور مسلم تاریخ کا دردناک باب ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے لئے دو 'عوامل' ذمہ دار ہیں۔ اس سلطنت کو انھیں دو عوامل نے ڈھایا۔ ان میں پہلا عامل حرکی اور اقدامی تھا اور دوسرا منفی اور سلبی۔ یہ دو عوامل تھے:

ا۔ توازن کا Erosion اور

۲۔ بدعنوانی (Corruption)

سلطنت مغلیہ بدعنوان عمال اور اہل کاروں کا متبادل فراہم کرنے میں ناکام ہوگئی اس لئے کہ 'علما' اور 'مشائخ' نے مسلم معاشرے میں اس کی ہر صورت کو منجمد کر دیا تھا۔ ملکی خارجی اخذ کی طبعی خصوصیات بالآخران احوال پر غالب آ گئیں جن کا خطرہ سلطنت کو ابتداء سے ہی تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. C.R. Wilson : The Early Annals of The English in Bengal; Vol.II, Part II, The Surman Embassy, The Asiatic Society, Calcutta: 1911, P-141-43.
2. : Drake to Fort William Council, Jan-17-25, 1757, Hill's Collection, Vol.III, P- 136.
3. : Law's Memoirs, Vol.III, Hill's Collection, P-165.
4. S. Bhattachary : The East India Company & the Economy of Bengal; 1704-40, Luzac & Co., London, 1954.
5. : Hill's Collection Vol. II, P-104 etc.
6. : A Statistical Account of Bengal, London, Trubner & Co., 1875-77, Vol. V, P-123.

دوسری جانب 'علما' اور 'مشائخ' نے اس بحران سے نکلنے اور ان بدعنوان عمال کا اہل متبادل فراہم کرنے کی ہر راہ بند کر دی تھی۔ 'علما' اور 'مشائخ' کا یہ عمل حرکی، اقدامی اور بنیادی تھا۔ بلاشبہ اس کے لئے مسلم معاشرہ بھی براہ راست ذمہ دار ہے جس نے 'علما' اور 'مشائخ' کی اندھی تقلید کی اور سلطنت مغلیہ کے حکمرانوں کی اصلاحی کوششوں کی علانیہ مخالفت کر کے ان حکمرانوں کو بالآخر ناکام بنا دیا۔ ظاہر ہے یہ 'انسانیت کے خلاف جرم' (Crime Against Humanity) تھا جس کے لئے مسلم معاشرہ راست ذمہ دار تھا۔ 'قدرت' نے اس جرم کی عبرتناک سزا دی۔ 1737 سے آج تک برصغیر کے مسلمانوں کو ملنے والی مسلسل سزا اس کی پاداشت ہے۔

صحیح

۱۔ عاجز کا خیال ہے کہ محض ان دونوں اسباب کے باوجود سلطنت مغلیہ اتنی کمزور نہ تھی کہ ٹوٹ جاتی۔ خود اس کا ادراک ایسٹ انڈیا کمپنی اور سلطنت برطانیہ کو بھی تھا۔ یہی ادراک 1858 کے ایکٹ کی عبارتیں طے کرنے میں بھی غالب رہا۔ سلطنت مغلیہ ختم ہو چکی تھی لیکن سلطنت برطانیہ پھر بھی باور کرنے کو اور ایسی عظیم تاریخی غلطی کرنے کو تیار نہ تھی جیسی عام طالع آزما بادشاہان یا حکومتیں کر بیٹھتی ہیں۔ لہذا سلطنت برطانیہ نے خود کو تاریخ کے سامنے جوابدہی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی اور خود کو فاتح اعلان کرنے سے گریز کیا۔

۲۔ 1713 سے سلطنت مغلیہ کے خلاف 'علما' اور 'مشائخ' کی 'انہدامی سازش' نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان کے طول و عرض میں 'علما' اور 'مشائخ' اور ان کے 'اداروں' کو سب سے زیادہ وسعت اور رسوخ حاصل ہوا۔ اسی حقیقت کا اظہار مٹکاف یوں کرتی ہیں:

"In general, the religious leadership profited from the decline in central authority in the eighteenth century. This was true not only of the 'Ulama' but also of the 'Sufi Pirs' of the medieval shrines who had continued to form the religious leadership in the areas of Sind and the Punjab, in particular."

ملاحظہ فرمائیں:

Barbara Daly Metcalf: Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900; Oxford University Press, 1982.

۳۔ 1713 سے علما اور مشائخ اس عالمی Club سے براہ راست مربوط ہو گئے جو عالمی پیمانے پر اسلام اور امت مسلمہ کا خاتمہ کرنے میں کوشاں تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں اس عالمی تحالف کا مرکز 1713 کے بعد دہلی میں مستحکم ہو گیا۔ ان عالمی قوتوں نے علما اور مشائخ کی Pump-Priming کی اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔

۴۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ 1858 میں جب کہ مغلیہ سلطنت فی الواقع ختم کر دی گئی، قلعہ فتح ہو گیا، آخری مغل حکمراں مجرم (؟) قرار دے کر جلاوطن کر دیا گیا اور چن چن کر سلطنت کے ہر ممکنہ دعویدار کو عالمی شکار (International Witchhunting) کے ذریعہ ختم کر دیا گیا بایں ہمہ سلطنت برطانیہ خود کو علانیہ حاکم کہنے سے گریز کرتی ہے۔ چنانچہ 1858 کا ایکٹ ان جملوں سے شروع ہوتا ہے:

"The territories of the East India Company were vested in her Majesty the Queen, and the powers exercised by the East India Company and the Board of Control were vested in the Secretary of State for India. He was to have a council for fifteen members who would hold office during good behaviour, and each member was to have a salary of £1200 a year out of the revenues of India. The pay of the Secretary of State and all his establishment would similarly be charged to India."

۵۔ مغلیہ سلطنت کی بین الاقوامی قانون (International Law) کے مطابق عملی، حقیقی اور قانونی حیثیت اور حالت کیا تھی اس کا اندازہ 1843 کے ایک واقعے سے لگایئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل ایلن برا (E.L. Ellenborough 1790-1871) نے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ انھیں بادشاہ چند لمحے اپنی بارگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔ جسے بادشاہ نے ٹھکرا دیا۔ تفصیل سنیئے:

''بسال یک ہزار وہشت صد و چہل و سہ از مسیحی نواب نامدار گورنر جنرل بہادر وزیر ہند مسٹر لارڈ ایلن برا راسر حضوری در بار در دل برخاست و چناں خواہش رفت کہ اگر رخصت نشستن بدر بار یابد (بہ بندگی

حاضر آید) بدر بار شاہد و لوازم دربار بجا آوردہ کورنش شاہانہ پیش گرفتہ نذر (غلامانہ) گذاردہ لختے زیر تخت قائم شدہ قہقری گردیدہ بجای کرسی آید و ساعتی برونشیند و ایں را پایۂ والا شناسد و نیایش کناں......داخل دولت گراید و بمقتضای سلطانی رضا پردازد، وہم طریقۂ نذر گزاری جا گیرد.......مسدودی یافتہ مرعی داشتہ، معلومی رااز اں بانتظام آردوانجام دوام دہد کہ........

........شاہ بآبروی بزرگان خود نظر نمودہ رضا نداد۔ وگزارش نشست او بدر بار مطبوع خاطر نیفتاد۔ (فرمود کہ امداد تو........ولی عرض مکرر و سفارش دگر فرمان نفاذ یافت کہ الا بہ بارگاہ والا گاہی چنیں توقع مدار)

ترجمہ: ''1843 میں نواب نامدار گورنر جنرل بہادر وزیر ہند مسٹر ایلن برا نے دربار میں حاضری کا ارادہ کیا اور انہیں یہ خواہش ہوئی کہ اگر دربار میں بیٹھنے کی اجازت مل جائے تو (آدابِ بندگی بجالائیں)، دوڑ کر وہاں پہنچ جائیں اور لوازم دربار بجالا کر، آداب شاہی ادا کریں اور نذر (غلامانہ) پیش کرنے کے بعد، الٹے پاؤں واپس آ کر کرسی پر زیر تخت کچھ دیر بیٹھیں، اور اس امر کو ''مرتبۂ عظیم'' سمجھیں۔ پھر مدح و ثنا کرتے ہوئے داخل دولت ہوں اور احکام سلطانی پر سر تسلیم خم کریں اور نذر بھی پیش کریں........ مسدود پاکر........ملحوظ رکھ کر........اس کے زر ونقد کو........انتظام سے لائے۔ اور مدادمت کے ساتھ پیش کرتا رہے........ بادشاہ نے اپنے بزرگوں کی آبرو (روایات) کا خیال کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ دی، اور دربار میں بیٹھنے کے متعلق ان کی گزارش مرغوب خاطر نہ ہوئی۔ فرمایا کہ تیری امداد........اور اس کا موقع دیئے بغیر کہ دوبارہ اس سلسلہ میں کوئی گزارش یا سفارش کی جائے، فرمان نافذ کیا کہ بارگاہ والا میں ایسی (یعنی بیٹھنے کی) توقع نہ رکھی جائے۔''

ملاحظہ فرمائیں:

خلیق احمد نظامی (مرتب): عبداللطیف کا قلعۂ دہلی کا ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامچہ: ندوۃ المصنفین، دہلی، 1971۔

۶۔ ایک جانب سلطنت برطانیہ کا رویہ 1858 اور اس کے وزیر ہند لارڈ ایلن برا کا رویہ 1843 اور دوسری جانب 'علما' اور 'مشائخ' کا مشہور و معروف رویہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا مدعی سست گواہ چست۔

خاندان ولی اللّٰہی کے صدر نشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے 1803 میں ایک 'غیر معمولی فتویٰ' جاری فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

''درایں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکم روساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری ست ومراد از اجراء احکام کفرانیست کہ در مقدمہ ملک داری وبندوبست رعایا واخذ خراج وباج وعشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق وسراق وفیصل خصومات وسزائے جنایات کفار بطور حاکم باشند آرے اگر بعضے احکام اسلام راشل جمعہ، عیدین واذان وذبح تعرض نہ کنند نہ کردہ باشند، لیکن اصل این چیزہا نزد ایشاں ہباء وہدرست زیرا کہ مساجدرا بے تکلف ہدم می نمایند وہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشان دریں شہرونواح نمی تواند آمد وبرائے منفعت خود از واردین مسافرین وتجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثلاً شجاع الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد وازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے در چپ وراست مثل حیدرآباد، لکھنؤ ورام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند سبب مصالحت واطاعت مالکان آں۔''

[ملاحظہ فرمائیں: شاہ عبدالعزیز: فتاویٰ عزیزیہ ج۔ا ص۔۱۷]

شاہ عبدالعزیز نے 1803 میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ شاہ عبدالعزیز کو یہ 'Locus Standi' کہاں سے حاصل ہوا؟ اس 'غیر معمولی' اور 'پراسرار' فتویٰ کے اجرا کا وقت سب سے بڑا سوال پیدا کرتا ہے۔ یہ فتویٰ ٹھیک اس واقعے کے بعد جاری کیا گیا جب جنرل لیک (1744-1808) نے دہلی میں کارروائی (1803) کی۔ ایسے ثبوت اب میسر ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ شاہ صاحب کا گھرانہ اس عالمی سازش کا مرکز تھا اور یہ فتوی اس عالمی طاقت کی سازش کا حصہ تھا تا کہ مسلمانوں میں افراتفری پیدا ہو اور وہ کوئی ایسی کارروائی کریں تا کہ انھیں ملک پر قبضہ کرنے کا موقع مل جائے۔

'علما' اور 'مشائخ' کے احوال کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

1. C.F. Andrews : Zaka ullah of Delhi: Cambridge;1929.
2. J. Sarkar : Fall of the Moghul Empire.
3. Munshi Mohanlal : Travels in Punjab, Afghanistan, Turkistan etc.; 1846.
4. Munshi Mohanlal : Journal of a Tour Through the Punjab, Afghanistan etc., with Lt. Barnes; 1834.
5. Percival Spear : Twilight of the Mughuls: Studies in Late Mughul Delhi: Cambridge; 1951.

6. Percival Spear : A History of Delhi under the Later Mughuls.

چنانچہ یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ 'علما' اور 'مشائخ' کی بدترین سازش اور مسلم معاشرے کی 'علما' اور 'مشائخ' کی اندھی تقلید کا نتیجہ تھا۔

۷۔ سلطنت مغلیہ ہوا پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ وہ برسرزمین ایک حقیقت (1556) تھی۔ اسے فوری طور پر اور مسلسل ایسے اہل کاروں کی ضرورت تھی جو سلطنت کو شفاف، مضبوط اور منضبط حکومت دے سکیں۔ مسلم معاشرہ اور اس میں قائم 'علما' کے تعلیمی نظام کی اجارہ داری ایسا کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ مجبور ہوکر اس نے ملک کے اندر ان لوگوں کی طرف دیکھا جو ایسے صاحب صلاحیت اہل کار فراہم کرسکتے تھے۔ [ملاحظہ فرمائیں: ابوالفضل علامی: آئین اکبری: آئین ۲۵] اکبر کی اصلاحات کے اندرونی محرکات یہی تھے۔ چنانچہ 'علما' نے اکبر کے خلاف وہی حربے آزمانے شروع کردیئے جو امت میں بے حد مقبول اور ان کے آزمودہ تھے۔ انھوں نے اکبر کو بددین اور کافر قرار دے دیا۔ 'علما' نے نعرہ بلند کیا:

پادشاہ امسال دعوای نبوت کردہ اند　　　گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

۸۔ سلطنت مغلیہ بے حد محتاط تھی۔ اس کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ اسے ایسے معتمد اہل کار مسلم معاشرے سے میسر آئیں لیکن 'علما' ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھے۔ مغلیہ حکمراں ملکی تاریخ، یہاں کے Anthropological Strands اور ان کی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف تھے اس لئے اس کے مضمرات و عواقب کے حوالے سے ان کی پریشانی اور ان کا محتاط ہونا قابل فہم تھا۔ لیکن ان کے سامنے کوئی راہ نہیں تھی۔ انہوں نے اسی احتیاط کو ملحوظ رکھا اور ایسے فیصلے کئے جن سے اوفق اور اعلی کوئی دوسری Anthropological Engineering نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن طویل مدت میں وہ اس کے منفی عواقب کے حوالے سے ہمیشہ پریشان رہے۔ ان کے اندیشے بالآخر سچ ثابت ہوئے۔ ملک کے اندر کے Anthropological Strands نے منفی اثرات قائم کرنا شروع کردیئے تھے۔ بہادر شاہ اول (1707-12) سے شاہ عالم (1759-1806) کے ذریعہ دیوانی کی منتقلی (1765) تک سارے ملک میں ان اہل کاروں کے سبب بدعنوانی کا راج ہو چکا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔ ایک جانب مسلم معاشرے سے اہل عمال فراہم ہونا ناممکن تھا اس لئے کہ 'علما' معاشرے کو Deconditioned کرنے کو بالکل تیار نہ تھے اور تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔

۹۔ دوسری جانب ملکی Anthropological Strands بے قابو ہو کر سارے ملک کو بدعنوانی (Corruption) کے جہنم میں جھونک چکے تھے۔ سلطنت مغلیہ بالخصوص اس کے عالی ہمت بادشاہ اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں اس نظام کو درست کرنے کے لیے قابل اعتماد اور صاحب صلاحیت متبادل کی تلاش تھی۔ مغلیہ بادشاہ دنیا سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ تاریخی تفصیلات بتاتے ہیں کہ اسے برطانوی سلطنت کی گہری واقفیت تھی۔ بدعنوانی (Corruption) کے حوالے سے اس وقت ہندوستان اور برطانیہ میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ برطانیہ ہندوستان کی طرح بدعنوانی (Corruption) کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ ہندوستان کی طرح برطانیہ کے سلاطین بھی اس بدعنوانی کا خاتمہ چاہتے تھے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک جوہری فرق دریافت ہوا۔ برطانیہ میں 'منبر' (Church) سلطنت کے تابع تھا۔ ہندوستان میں 'منبر' خودسر اور بے قابو تھا۔ مغلیہ بادشاہ کو اس کی خبر تھی کہ برطانیہ میں ایسی قوتیں بھی ہیں جو اس ہمہ گیر بدعنوانی کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ بادشاہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستان اور برطانیہ میں ایک اور جوہری فرق ہے۔ برطانیہ میں 1688 کے بعد ایک عوامی پارلمان موثر طور پر قائم ہے جہاں بدعنوانیاں فوراً سامنے آجاتی اور ان کے تدارک کی راہ نکلنے کی امید باقی رہتی ہے۔ جب کہ ہندوستان میں 'علما' اور اس کے زیر اثر معاشرے نے امرا (Aristocrates) کی تادیب کی ہر راہ بند کر دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کے کانوں میں ولیم پٹ اول (William Pitt-I- The Earl of Chatham, 1708-78) کی برطانوی پارلمان میں بلند ہونے والی صدا پہنچی تھی:

"I am sure that I can save the country, and that no one else can."

لارڈ چیتھم نے اپنا عہد پورا کیا۔ اس نے 1761-1757 کے دوران اپنے دور اقتدار میں برطانیہ کو بدعنوانی سے پاک کر دیا جس پر آج سلطنت برطانیہ کھڑی ہے۔ اسی طرح مغلیہ بادشاہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے بدعنوان عناصر نے باہم مل کر ہندوستان میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔ کمپنی کے اہل کاروں نے سلطنت مغلیہ کے ہندوستانی اہل کاروں کے ساتھ مل کر بدعنوانی کا راج قائم کر رکھا ہے۔ یہ بھی لگتا ہے کہ بادشاہ کو اس کی بھی خبر تھی کہ کمپنی کے ایماندار اور بدعنوان انگریز اہل کاروں میں باہم کیسی جنگ برپا ہے۔ بادشاہ کو اس کی بھی خبر تھی کہ کمپنی کے ایماندار اہل کار کس جدوجہد میں سرگرداں ہیں۔ بادشاہ کی اپنی حالت کیا تھی؟ 'علما' اور 'امرا' نے اس کی کیا حالت بنا رکھی تھی؟ اس کے اظہار کے لیے صرف ایک اصطلاح

جو اس کے ایک ہمعصر تاریخ داں نے استعمال کی تھی کافی ہوگی: A Homeless Wanderer۔
تاریخ داں نے لکھا:

"The feeble descendent of the Emperor of Delhi was a homeless wanderer, but was still recognised as a titular soveriegn of India."

'اردوی معلّی' میں زندگی بسر کرنے والے اولوالعزم مغلیہ حکمرانوں کے لئے یہ اصطلاح کیسی عبرت ناک کہی جاسکتی ہے؟

۱۰۔ ایسا لگتا ہے کہ رابرٹ کلائیو (1725-1774) کے ذہن (Mind) کی خبر بادشاہ کو تھی اور برطانیہ میں ولیم پٹ اول کی وزارت عظمیٰ اور رابرٹ کلائیو کی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سربراہی میں اسے ہندوستان کے بدترین حالات میں اصلاح حال کی روشنی نظر آرہی تھی۔ رابرٹ کلائیو کا وہ خط جو اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے Court of Directors کو 30 ستمبر 1765 کو لکھا تھا اس کی تصدیق کرتا ہے۔
رابرٹ کلائیو نے لکھا:

"2. Upon my arrival, I am sorry to say, I found your affairs in a condition so nearly desperate as would have alarmed any set of men whose sense of honour and duty to their employers had not been estranged by the too eager pursuit of their own advantage. The sudden, and among many, the unwarrantable acquisition of riches, had introduced luxury in every shape and in the most pernicious excess. These two enormous evils went hand in hand together through the whole Presidency, infecting almost every member of each Department; every inferior seemed to have grasped at wealth that he might be able to assume that spirit of profusion which was now the only distinction between him and his superior........ It is no wonder that the lust of riches should readily embrace the proferred means of its gratification, or that the instruments of your power should avail themselves of their authority, and proceed even to extortion in those cases where

simple corruption could not keep pace with their rapacity. Examples of this sort, set by superiors, could not fail of being followed in proportionable degree by inferiors; the evil was contagious, and spread among the civil and military, down to the writer, the ensign, and the free merchant........

"9. Two paths were evidently open to me; the smooth one, and strewed with abundance of rich advantages that might be easily picked up; the other untrodden, and every step opposed with obstacles. I might have taken charge of the government upon the same footing on which I found it; that is, I might have enjoyed the name of Governor, and have suffered the honour, importance, and dignity of the post to continue in their state of annihilation............... An honorable alternative, however, lay before me; I had the power within my breast to fulfil the duty of my station, by remaining incorruptible in the midst of numberless temptations artfully thrown in my way; by exposing my character to every attack which malice or resentment are apt to invent against any man who attempts reformation; and by encountering, of course, the odium of the settlement. I hesitate not a moment which choice to make; I took upon my shoulders a burden which requires resolution, perseverence, and constitution to support. Having chosen my part, I was determined to exert myself in the attempt, happy in the reflexion that the honour of the nation, and the very being of the Company would be maintained by success........

"12. The sources of tyranny and oppression, which have been opened by the European agents acting under the authority of the Company's servants, and the numberless black agents and sub-agents acting also under them, will, I fear, be a lasting reproach to

the English name in this country........ I have at last, however, the happiness to see the completion of an event which, in this respect as well as in many others, must be productive of advantages hither to unknown, and at the same time prevent abuses that have hither to had no remedy: I mean the Dewanee, which is the superintendency of all the lands and the collection of all the revenues of the Provinces of Bengal, Behar and Orissa. The assisstance which the Great Moghal had received from our arms and treasury made him readily bestow this grant upon the Company; and it is done in the most effectual manner you can desire. The allowance for the support of the Nebob's dignity and power, and the tribute to His Majesty [The Great Moghal] must be regularly paid; the remainder belongs to the Company........."

(House of Commons Committee's Third Report, 1773, Appendix, PP. 391-398)

۱۱۔غور کیا جائے تو اس صورتحال میں سلطنت مغلیہ کے پاس کوئی راہ نہ تھی۔ایسی حالت میں اس کا یہ فیصلہ انتہائی دانشمندانہ تھا۔حالات کا دقیق جائزہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

۱۔ بے حساب خارجی اخذ (Outsourcing) ہونا یا کرنے کے لئے مجبور ہونا۔

۲۔'علما' کے سبب خارجی اخذ (Outsourcing) کا متبادل فراہم کرنے سے مسلم معاشرے کا معذور ہو جانا۔

۳۔ بے حساب خارجی اخذ (Outsourcing) کے ذریعہ پیدا کردہ ہمہ گیر بدعنوانی کا دور دورہ ہو جانا۔

۴۔ مسلم معاشرے کے مکیف (Conditioned) ہونے کے سبب بدعنوانی سے نجات کی راہ کا بند ہو جانا۔

۱۲۔'علما' اور 'مشائخ' کی سازش (؟) کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ شاہ ولی اللہ (1703-1762) کو

سلطنت مغلیہ کا مسئلہ پونے میں اور اس کا حل قندھار میں نظر آیا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے حل 1761 نے پیدا شدہ وقتی عدم استحکام کو دائمی عدم استحکام میں بدل دیا۔ کیا نجیب الدولہ (ف۔1770) جنھیں شاہ صاحب نے رئیس المجاہدین، امیر الغزاۃ اور منبع الحسنات لکھا تھا اور جن پر ابدالی (ف۔1773) نے اس 'در بدر بھٹکنے والے بادشاہ' کی حفاظت کی ذمہ داری ڈالی تھی ان کے لائق فرزند ضابطہ خاں (ف۔1783) نے وہ ذمہ داری ادا کی؟ شاہ ولی اللہ کے ممدوح کے پوتے اور ضابطہ خاں کے فائق بیٹے غلام قادر خاں (ف۔1788) نے 10 اگست 1788 کو شاہ صاحب کے ذریعہ پیدا کردہ دائمی عدمِ استحکام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناقابل رجوع (Perpetually Irreversible) بنا دیا۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ محمد عاشق پھلتی: القول الجلی فی ذکر آثار الولی: حضرت شاہ ابوالخیر اکادمی: دہلی۔

۲۔ خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ندوۃ المصنفین، دہلی۔

۳۔ Dr. Ganda Singh: Ahmad Shah Durranee: Father of Modern Afghanistan: 1959.

۴۔ J.N. Sarkar: Fall of the Moghul Empire:

۵۔ غلام حسین خان طباطبائی: سیر المتاخرین۔

۱۳۔ بلاشبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ذمہ داروں نے استعماری جسارت (Colonial Entrepreneurship) کا مظاہرہ کیا لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کے سنبھالنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس ضمن میں انھیں Walkover مل گیا۔ جب ذمہ داریاں ان کے پاس آگئیں یا ان کے اوپر تھوپ دی گئیں تب انھیں اس کا ادراک ہوا۔ 1824 تک ان کا رویہ یہی بتاتا ہے کہ وہ تجارتی اور پھر زیادہ سے زیادہ استحصالی (Commercial & Exploitative) جذبہ ہی سے سرشار تھے۔ حکمرانی کی انھوں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انھیں بلاشبہ اس نئی صورتحال کے قبول کر لینے میں اپنے تجارتی اور استحصالی عزائم کی بہتر تکمیل کی صورت نظر آئی ہوگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کرنے کے اختیارات 1833 کے بعد ہندوستان میں سلب کر لئے گئے۔ 1837 کے بعد صورتحال میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں۔ تاریخ کے کسی طالب علم کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر برطانیہ میں لارڈ چیتھم اپنے ملک سے بدعنوانیاں ختم کرنے میں

اور ملکہ وکٹوریہ (حکمرانی: 1837-1901) اسے ترقی یافتہ اور فلاحی مملکت بنانے میں کیوں کامیاب ہوگئے جب کہ سلطنت مغلیہ ہندوستان میں اس میں ناکام ہوگئی؟ دونوں ملکوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اس کے دو اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

۱۔ برطانیہ میں منبر [Pulpit (Church)] سلطنت کے تابع فرمان تھا جب کہ سلطنت مغلیہ میں 'علما' خود مختار، خودسر اور بے قابو تھے۔

۲۔ برطانیہ میں نظام تعلیم سلطنت کے تابع یا آزاد تھا جب کہ سلطنت مغلیہ میں حکومت کی کوششوں کے باوجود 'مسلم نظام تعلیم' پر 'علما' کی اجارہ داری ہنوز برقرار تھی اور انہوں نے پورے مسلم معاشرے کو ذہنی اور علمی اعتبار سے صدفی صد مکیّف (Conditioned) بنا رکھا تھا اور مسلم معاشرہ 'علما' اور 'مشائخ' ہی کے زیر اثر اور ان کے سحر میں مبتلا تھا۔

۱۴۔ انگریز اپنے Constraints سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ 1765 سے ان کے کاندھوں پر آئی ذمہ داریوں کے ادراک نے انھیں پریشان کر دیا۔ انھیں ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں نظم و نسق کے لئے افراد کار اور مخصوص صلاحیتیں درکار تھیں۔ ان کے اپنے Constraints تھے۔ ان کی مجبوریاں زیادہ شدید تھیں۔ اعلیٰ ہنر مند انسانی وسائل (Highly Skilled Human Resources) کی بات ہو یا متوسط اور عمومی ہنر مند انسانی وسائل (Medium & Lower Skilled Human Resources) کی وہ سخت قلت (Constraint) کے شکار تھے۔ برطانیہ کی پوری قابلِ کار (Workable) آبادی کو بھی اگر وہ یہاں درآمد کر لیتے جب بھی یہاں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ ان کے Constraints قلیل مدتی یا طویل مدتی منصوبہ بندی سے ختم ہونے والے نہیں تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے لئے کئی طویل ترین منصوبہ بندیوں (Perspective Plannings) کی ضرورت تھی۔ سچ یہ ہے کہ اگر ان کی حقیقی صورتحال اور ان کی نفسیات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ہندوستان میں حکمرانی کرنے کے جنجال میں پھنسنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہ بلا تو ان کے سر آ گئی تھی۔ وہ محض تجارتی اور زیادہ سے زیادہ استحصالی جذبہ کی تکمیل چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان شمالی امریکہ یا افریقہ نہیں۔ ہندوستان دنیا کی عظیم سلطنتوں میں سے ایک تھا۔ وہ یہاں ویسا سلوک روا نہیں رکھ سکتے تھے جیسا امریکہ میں رکھا گیا تھا۔ پھر انہوں نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یوروپ سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں کا ردعمل بھی دیکھ لیا تھا جو ریاست ہائے متحدہ کی تشکیل (1776) کی شکل میں

ان کے سامنے آیا۔1833 میں جب سلطنت برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے سے روک دیا حتی کہ 1858 میں جب حکمرانی کی ذمہ داری خود سلطنت برطانیہ نے عبوری طور پر اپنے کاندھوں پر لے لی تب بھی یہ بات ان کے سامنے واضح تھی اور انھوں نے 1858 کے ایکٹ کے عنوان میں ہی اسے واضح کردیا تھا کہ وہ یہاں حکمرانی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ ذمہ داری چونکہ اس کے سر آگئی تھی لہذا وہ اس سے پہلو تہی بھی نہیں کرسکتی تھی۔سلطنت برطانیہ خوب جانتی تھی کہ اس کے Constraints اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ یہاں باضابطہ حکمرانی کرے۔ چنانچہ انہوں نے 1877 تک اسے عملاً ایک Police State رکھا جہاں انھوں نے صرف Policing کی۔چنانچہ 1765 میں ایسٹ انڈیا کمپنی بالکل اس قابل نہیں تھی کہ وہ ہندوستان کا نظم ونسق چلا سکے۔اس نے اب تک چلے آرہے عمال اور اہل کاروں کو صرف موجہ (Orient) کرنا چاہا۔اس سلسلے میں انھوں نے اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کو ابتداء اس توجیہ (Orientation) میں شامل ہونے یا رہنے کی کھلی دعوت دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے از حد انتظار کیا۔خواہ کسی تزویر (Machination) سے ہی سہی قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) غالب ہو جانے والی قوت کے لئے قانوناً (Legally) غالب ہوجانا محض لمحاتی رسم کی ادائیگی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی نے تحمل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔حقیقی اور برسر زمین ضرورتیں اور مطالبات انھیں بحران میں مبتلا کرنا شروع کرچکی تھیں۔ اپنی ان نئی ذمہ داریوں کی باحسن ادائیگی کے لئے انھوں نے اپنی ساری قوت جھونک دی۔ انھوں نے اپنے لوگوں کو ایسے کام کرنے پر مجبور کیا یا اس کی بھاری قیمت ادا کر کے ترغیب دی جن کا کرنا ان کے لئے آسان نہ تھا۔انھوں نے اپنے لوگوں کو عربی، فارسی اور اردو پڑھوائی۔امور انتظامی (حکمرانی) ادا کرنے کے لئے زیر انتظام لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے مشرقی علوم (Oriental Studies) میں دسترس حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ برطانیہ میں محیرالعقول ہیلی بری کالج Haileybury College جیسا ادارہ قائم کیا۔کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج (Fort William College) قائم کیا تاکہ وہاں ان کے افراد تیار ہوں۔ ہندوستان کے نظم ونسق کے لئے آکسفرڈ (Oxford) اور کیمبرج (Cambridge) سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد اور اہل علم کو درآمد کرنے کی کوشش کی۔ بالفاظ دیگر اگر یہ کہا جائے تو اس میں کیا غلط ہوگا کہ اپنے کاندھوں پر تھوپی ہوئی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے برطانیہ میں ہندوستان کے لئے Braindrain کیا۔

مشرقی علوم (Oriental Studies) میں مہارت کے لئے انھوں نے اپنی توانائیاں جھونک دیں۔

[یہاں جملۂ معترضہ کے بطور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ داعی الی اللہ اور شھداء علی الناس مسلم قوم کے یہ 'علما' جو خود کو انبیا کے وارث قرار دیتے ہیں کیا انھیں 712 سے اٹھارہویں صدی تک کبھی ایسی توفیق ہوئی تھی کہ ہندوستان کے طول وعرض میں بسنے والی ہزاروں قوموں اور طبقات کی نفسیات کو باضابطہ سمجھنے اور ان میں عدل کے قیام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایسے ادارے قائم کریں، ایسی مہم جوئی کریں اور اس میں اپنے افرادکار کی توانائیوں کو جھونک دیں۔ ان سوالوں کا جواب (۱) البیرونی کی فی تحقیق ما للھند، (۲) شبلی نعمانی کے مضامین مشمولہ مقالات شبلی جلد دوم (بھاشا زبان اور مسلمان اور تحفۃ الھند اور (۳) گیان چند: ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب میں درج حوالوں سے نہیں دیا جاسکتا۔]

۱۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مسلم 'نظام تعلیم' کے ذمہ داروں کی جانب ملتجیانہ دیکھتی رہی لیکن یہ 'علما' ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ پھر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے تحمل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس نے درمیانی راہ نکالنا چاہی۔ 'دہلی کالج' وہی درمیانی راہ تھی۔ 'علما' پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ بالآخر برسرزمین حقیقی ذمہ داریاں انھیں کب تک اس تحمل اور لاحاصل انتظار کی اجازت دیتیں۔ مجبور ہو کر انھوں نے ساری بساط ہی پلٹ دی اور پورے ملک میں سرکاری طور پر 'مغربی زبان' بحیثیت ذریعۂ تعلیم اور 'مغربی نظامِ تعلیم' بحیثیت 'نظام تعلیم' نافذ کرنے کا حکم جاری کردیا۔ یہ 'حادثہ' ایک نئے بحران کا آغاز تھا۔ روایتی ورموروثی عمودی ثنویت (Traditional Vertical Dichotomy) اور روایتی افقی ترادفیت (Traditional Horizontal Dualism) سے صدیوں مضمحل (Degenerated) اور نیم نسان شدہ (Dehumanized) مسلم معاشرہ اچانک پیدا ہو جانے والی نوثنویت (Neo-Dichotomy) کا شکار ہوگئی۔ انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم وسرکاری زبان اور مغربی نظام تعلیم ور 'نظامِ تعلیم' کے نفاذ سے جو نوثنویت (Neo-Dichotomy) پیدا ہوئی اس نے مسلم معاشرے کو ودی (Vertically) طور پر ذہناً اور علماً منقسم کر کے رکھ دیا۔ یہ عمودی نوثنویت (Vertical Neo-Dichotomy) کتنی گہری، مہلک اور دوررس نتائج کی حامل ثابت ہوئی اس کا اندازہ آج دوسو لوں کے بعد بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ عاجز نہیں جانتا کہ پروفیسر مشیرالحسن نے جن تاریخی نارسائیوں کا ذکر یا ہے اس کی اصل کنہہ سے وہ واقف ہیں؟ عین ممکن ہے کہ وہ اس کا ادراک رکھتے ہوں کہ اس تاریخی

نارسائی کی جڑ یہی عمودی نوشنویت (Neo-Dichotomy) ہے جو دو سو سال پہلے مسلم معاشرے میں پیدا ہوگئی تھی۔ پروفیسر مشیر الحسن لکھتے ہیں:

"Yet academic circles in India were neither prepared nor intellectually equipped (most have no knowledge of Persian and Urdu) for a serious engagement on issues underlined in their (ie. Aziz Ahmad & Mohammad Mujeeb's) remarkably perceptive writings."(Prof. Mushirul Hasan: Introduction: Aligarh's First Generation: David Lelyveld: OUP. 2010)

ایسی ثنویت لازماً بغیر تاخیر کے ترادفیت کے قائم کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ دو سو سال قبل موجود حالات تو اس کے لئے زیادہ سازگار تھے۔ چنانچہ مسلم معاشرہ آناً فاناً افقی نو۔ترادفیت (Horizontal Neo-Dualism) کا شکار ہو کر رہ گیا۔

صبحِ بام

ا۔ مشہور مثل ہے: ''عدو شری برانگیزد کہ خیر ما درآں باشد'': چنانچہ اس شر کے بطن میں ایک خیر پوشیدہ تھا جو جلد برآمد ہوگیا۔ 661 عیسوی کے بعد پہلی بار مسلم تاریخ میں ایک نئے اور عدیم النظیر (Unprecedented) باب کا آغاز ہوا۔ مسلم تاریخ میں قائم ہونے والا حکمراں۔علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) دیکھتے دیکھتے پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ چودہ سو سال سے تکلیف (Conditioning) کی قید میں پابہ زنجیر مسلم معاشرہ اب آزاد ہو چکا تھا۔ 'عظیم حکمراں' جا چکے تھے۔ اب حکمراں تھے نہ ان کا افقی ملکیف خانہ۔ عُمّال تھے نہ عساکر۔ مسلم معاشرے میں نصف قوم عمودی طور پر معدوم یا نئے نظام میں جذب ہو چکی تھی۔

۲۔ یہی وہ عہد تھا جب ایک عجیب وغریب آواز گونجی جس کی لے رفتہ رفتہ تیز ہوتی چلی گئی:

ا۔ آواز آئی:

آھی بہ عشق فاتح خیبر کنیم طرح — در گنبد سپہر مگر در کنیم طرح
در فصل دی کہ گشتہ جہاں زمہریر ازو — بنشیں کہ آب گردش ساغر کنیم طرح
خود را بشاہدی پرستیم زیں سپس — در راہ عشق جادۂ دیگر کنیم طرح

(۱۸۳۷)

۲۔ پھر آواز اور بلند آہنگ ہوئی:

هرچه در جزیه زگبراں می ناب آوردند به شب جمعۂ ماه رمضانم دادند
هرچه از دست گهه پارس به یغما بردند تا بنالم هم از آن جمله زبانم دادند

(۱۸۳۷۔۳۸)

۳۔ پھر آواز کا آہنگ اور تیز ہوا:

گفت کا ندر معرض اسرار دوست هر که باشد طالب دیدار دوست
خواهد از نور جمال یار خویش روکش مشرق در و دیوار خویش
بایدش کاشانه نیکو ساختن حجره از نا محرماں پرداختن
خار و خس از خانه بیروں ریختن مشک تر با خاکِ ره آمیختن
زاں سپس کایں کار را یکر و کند خانه را زیں گو نه رفت و رو کند
آورد آب و زند در ره گذار تا هوا از ره نه می گیرد غبار
برگ گل در ره فشاند مشت مشت تانیاید خاک زیر پا درشت
رخت گرد آلود ازتن بر کشد جامۂ پاکیزه اندر بر کشد
چوں در آید آں نگار از خود رود خوش با ستقبالِ یار از خود رود
عاشق از خود رفت دلبر ماند و بس سایه گم شد، مهرانور ما ند و بس
جمله جاناں ماند و جسم و جاں نماند حسرتِ وصل و غم هجراں نه ماند
شبنمی را طعمۂ خورشید کن خویش را قربانی ایں عید کن
تیرگی بزدائی تارخشاں شوی قطرگی بگذار تا عماں شوی

(۱۸۵۰۔۵۷)

۴۔ پھر یہ آواز نوائے سروش کی طرح گونجی:

بر چنیں کاری کہ اصلش ایں بود
آں ستاید کش ریا آئیں بود

من کہ آئینِ ریا رادشمنم
دروفا اندازہ دان خود منم

گربدیں کارش نگویم آفریں
جای آن دارد کہ جویم آفریں

صاحبان انگلستاں را نگر
شیوہ و انداز ایناں را نگر

تاچہ آئیں ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہر گز کس ندید، آوردہ اند

زین ہنر مندان ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت

حق ایں قومست 'آئین' داشتن
کس نیارد ملک بہ زین داشتن

داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گو نہ آئین بستہ اند

آتشی کز سنگ بیرون آورند
این ہنر منداں زخس چوں آورند

تاچہ افسوں خواندہ اندایناں بر آب
دودکشتی را ہمی راند در آب

گہ دخاں کشتی بجیحوں می برد
گہ دخان، گردون بہاموں می برد

غلتک گردوں بگرداند دخاں
نرہ گاو واسپ را ماند دخاں

از دخاں زورق برفتار آمدہ
باد و موج، این ہر دو بیکار آمدہ

نغمہ ہا بی زخمہ از ساز آورند
حرف چوں طائر بپرواز آورند

ہین، نمی بینی کہ این دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ

میزنند آتش بباد اندر ہمی
میدرخشد باد چوں اخگر ہمی

رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ
شہر روشن گشتہ درشب بے چراغ

کاروبار مردم ہشیار بین
در ہر آئین صد نو آئیں کار بین

ہر خوشی راخو شتری ہم بودہ است
گرسری ہست، افسری ہم بودہ است

مبدأ فیاض را مشمر بخیل　　نوز میریزد رطب ہا زان نخیل

در جہاں سید پرستی دیں تست　　از ثنا بگزر دعا آئیں تست

ایں سراپا فرہ و فرہنگ را　　سید احمد خان عارف جنگ را

ہر چہ خواہد از خدا موجود باد　　پیش کارش طالع مسعود باد

غالب کی بات سرسید احمد خاں کے دل میں بالآخر اتر گئی یا غالب کی دعا مبدأ فیاض نے قبول کر لی اور غالب کو سرسید احمد دے دیئے گئے۔

۳۔ تاہم بہت دیر ہو چکی تھی۔ اِدھر غالب کا انتقال (1869) ہوا اُدھر سرسید برطانیہ کے لئے روانہ (1869) ہوئے۔ برطانیہ کے قیام کے دوران انہوں نے برطانیہ میں رائج 'تعلیمی نظام' کو بغور دیکھا۔ برطانیہ اس وقت تعلیمی اصلاحات کے طوفانوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں خود اصلاحات پر زبردست بحث چل رہی تھی۔ 1870 میں سرسید ہندوستان واپس آئے۔ برطانیہ سے واپسی پر ایک 'تعلیمی منصوبہ' سرسید کے دماغ میں تشکیل پا چکا تھا۔ جو دو مرحلوں میں آگے بڑھا:

ا۔

"Committee for the Better Diffusion and Advancement of Learning Among Muhammadans of India " (CBDALMI)

کا قیام (۱۸۷۰)۔۔اور

۲۔

Muhammadan Anglo-Oriental College Fund Committee

کا قیام (۱۸۷۲)۔

بالآخر 1875 میں محمڈن اینگلو۔ اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آ گیا۔ 1876 میں سرسید نے وظیفہ یاب ہو کر مستقل طور پر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی اور اپنی وفات (1898) تک اس منصوبہ کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے کوشاں رہے۔

۴۔ سرسید نے علما کو یقین دلایا کہ گزشتہ دو سو سالوں کی کوتاہیوں کی تلافی اب بھی ممکن ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ انھوں نے کم از کم دو سو سال ضائع کر دیئے ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کو بطور

ذریعۂ تعلیم مسلّم رکھتے ہوئے علما بر سرزمین مطلوب حقیقی ضرورتوں کے لئے افرادِ کار فراہم کرنے اور ثنویت اور نوترادفیت کا سدباب کرنے میں ناکام رہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پوری قوم ہولناک نتائج سے دوچار ہوگئی۔ سرسید نے پوری قوت سے علما پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ بر سرِ زمین حقائق اور ان کے سبب وقوع پذیر تبدیلیوں کا اگر اب بھی ادراک کرلیا جائے تو تلافی مافات ممکن ہے۔ سرسید نے بھرپور یقین دلایا کہ یہ کام اب بھی ممکن ہے بلکہ متنبہ کیا کہ اگر ایسا اب بھی نہ کیا گیا تو اس کے بھیانک نتائج قوم کو بھگتنے ہوں گے۔ اب بھی موقع ہے مسلمان خود اپنے ہاتھوں اور اپنے زیرانتظام ایسے تعلیمی ادارے قائم کرلیں جن کے سہارے نوثنویت اور نوترادفیت کے مہلک اثرات سے نجات ممکن ہو۔ سرسید نے یہ بات بھی واضح کی کہ ایک ایسا نظام تعلیم جس کے ذریعہ 'اسلامی نظام تعلیم' اپنی وحدت، وحدانیت اور خود کفالت مسلّم رکھ سکے اور بہر صورت اس بدترین مہلکہ یعنی ''فکری، ذہنی، علمی اور تعلیمی ثنویت وترادفیت'' کا شکار نہ ہو جو قوموں کو ہلاک کرکے رکھ دیتی ہے تشکیل دینا ناگزیر ہوگیا ہے۔ لیکن افسوس تاریخ کے ایسے نازک موڑ پر جب مسلمان اقتدار کھو چکے تھے اور مسلم معاشرت سرعت سے اپنی حیویت (Vitality) کھوتی جارہی تھی علما نہ صرف یہ کہ ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ الٹے پوری شدت سے سرسید کے خلاف اٹھ کھڑے ہوگئے۔ علما نے سرسید کی تکفیر کی۔ انھیں زندیق، نیچری اور کافر قرار دے دیا۔ چنانچہ یہی وہ گھڑی تھی جب چودہ سو سال کی تکییف (Conditioning) سے نسبتاً کم نقصان کے ساتھ باہر نکل آنے کا زریں موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بعد ہمہ جہت 'ہلاکت' مسلمانوں کی تقدیر بنادی گئی۔ اس کے ذمہ دار صد فی صد 'علما' تھے۔ 'علما' نے اپنی روایتی ضد یا طبع میں بچے کھچے اسلام اور امت مسلمہ دونوں کا خاتمہ کرکے رکھ دیا۔

۵۔ 1858 کے بعد ہندوستان میں مسلمان منقسم ہوگئے۔ یہ تقسیم تاریخی اور بے نظیر تھی۔ 661 عیسوی سے چلی آرہی مسلم تاریخ میں آج تک ھسپانیہ کو چھوڑ کر امت کبھی اور کہیں ایسی 'آزمائش' سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ 'علما' کو امت کی تاریخ کا کیا علم؟ انھیں اپنے اعمال کے مضمرات وعواقب کی کیا پرواہ؟ سرسید نے وہ خطرہ محسوس کرلیا جو شاید ہی ان کے کسی ہم عصر نے محسوس کیا ہو۔ ہندوستان میں سرسید جیسا عبقری باستثنائے غالبؔ شاید ہی ملت اسلامیہ میں پیدا ہوا ہو۔ اندلس صرف اس لئے اسپین بن گیا کہ وہاں پندرہویں صدی عیسوی میں کوئی سرسید پیدا نہ ہوا۔ 1737 عیسوی میں سرسید موجود نہیں تھے اس لئے فیض آباد، عظیم آباد اور حیدرآباد ترقی کرگئے۔ سرسید کا یہ کارنامہ تاریخ میں زندہ جاوید رہے گا کہ انھوں

نے Allygurh کو Aligarh بنایا۔ سرسید کے جانشیں سرسید کی عبقریت کو کہاں پاسکے؟ کاش ان کے رفقائے مقربین میں سے کوئی عارف جنگ کا عُشرِ عَشیر بھی ہوتا! بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امت مسلمہ بدایوں، مین پوری، متھرا، گڑگاؤں اور بالخصوص علی گڑھ اور بلند شہر کے زمینداروں کے احسانات کا بدلہ چکانے سے قاصر ہے۔ ممکن ہے مبدأ فیاض کی رضا سے نواب مصطفی خاں شیفتہؔ (1806-1869) کی روحِ پرفتوح نے ان زمینداروں کی ارواح طیبات پر تصرف کیا ہو۔ شیفتہؔ کے بارے میں غالبؔ (1797-1869) نے کہا تھا:

غالبؔ بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او نوشت در دیواں غزل تا مصطفی خاں خوش نکرد

(۱۸۴۰_۲۹)

بھیکم پور، چھتاری، پہاسو، پنڈراول، محمود آباد وغیرہ کی قربانیاں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ یا شاید امت نے ان کے احسانات کا بدلہ چکا دیا بایں صورت کے وہ سرسید اور ان کے نادر پوتے سرراس مسعود کی آخری آرامگاہ کی مجاورت سے علی گڑھ کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ کیا علی گڑھ کے لئے یہ فخر کم ہے کہ وہاں امت مرحومہ کے یہ دونوں لعلِ فلک مدفون ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج پورا عالم اسلام اسپین صرف اس لئے نہ بنایا جا سکا کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں سرسید پیدا ہو گیا؟ اس عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ کی روح 1898 میں قفس عنصری سے پرواز کر گئی مگر اس کے عہد کی آمد آمد ہے۔

۲۔ 1858 کے بعد نوثنویت (Neo-Dichotomy) مسلمانوں کا مقدر بن گئی۔ یہ نوثنویت اُفقی (Horizontal) ہوتی تو بسا غنیمت تھی۔ لیکن 'علما' کے ضِد اد، تعنت اور عناد نے اسے پوری طرح عمودی (Vertical) بنا کر رکھ دیا۔ پوری ملتِ اسلامیہ عمودی طور پر (Vertically) دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ثنویت کبھی تنہا وارد نہیں ہوتی بلکہ اپنے جلو میں لازماً ترادفیت (Dualism) لے کر آتی ہے۔ چنانچہ مسلمان نوترادفیت (Neo-Dualism) کا بھی شکار ہو گئے۔ 1858 سے مسلمانوں کے مابین پیدا ہو جانے والی اس عمودی نوثنویت (Vertical Neo-Dichotomy) اور افقی نوترادفیت (Horizontal Neo-Dualism) کے دو سنگین نتائج برآمد ہوئے:

ا۔ 'مدرسے' بحران کا شکار ہو گئے۔ دارالعلوم، دیوبند 1867 میں قائم ہوا۔ محمڈن اینگلو۔ اورینٹل کالج، علی گڑھ 1875 میں قائم ہوا۔ دونوں پر حکمرانوں کی گہری نگاہ تھی۔ دونوں کے مضمرات وعواقب سے انھیں دلچسپی تھی۔ حاسدین کی سرسید پر ویسی ہی نگاہ تھی جیسی اہل بیت پر ابلیس کی۔ علما نے حسبِ روایت

مدرسوں کو مزید سکیڑ کر 'جوئے کم آب' بنا دیا۔ 'مدرسے' پہلے بھی کبھی 'بحرِ ذخار'، 'مجمع البحرین' اور 'ملتقی الابحر' نہیں رہے تھے۔ حکمران۔ علما تعہد نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہ مدرسے کبھی بھی ملت اسلامیہ کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے والے نہیں رہے۔ یہ درست ہے کہ عامۃ المسلمین کو کبھی اس کا احساس یا ادراک نہیں ہوا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ حکمرانوں اور ملت کی بیشتر ضرورتیں خارجی اخذ (Outsourcing) سے پوری ہو جاتی تھیں۔ مسلم معاشرے میں رائج نظامِ تعلیم کے جس کی مکمل اجارہ داری 'علما' کے پاس تھی بدترین رول کو سمجھنے کے لئے صرف انشاء کی ان کتابوں کا جائزہ لے لینا کافی ہوگا جو سلطنت مغلیہ میں بیوروکریٹس کی تربیت کے لئے تیار ہوئی تھیں جن کی فہرست مثلاً 'مقدمہ رقعات عالمگیری' [ملاحظہ فرمائیں: نجیب اشرف ندوی: مقدمہ رقعات عالمگیری: دارالمصنفین:] کے پیش لفظ میں دی گئی ہے۔

۷۔ گزشتہ بارہ سو سالوں سے 'علما' کی فکری، ذہنی، دماغی اور عملی حالت اور امتِ مسلمہ کے ساتھ ان کے تعامل کی صورتحال دراصل ان کی نفسیات کی عکاس ہیں۔ 'علما' کی نفسیات کے جدیلۂ اصلی (Strand) کے تفصیلی تجزیئے کی یہاں گنجائش نہیں تاہم انیسویں صدی عیسوی میں جب سرسید نے انھیں اصلاحِ حال کے لئے آواز دی اس وقت علما کی نفسیات کیا تھی، ان باتوں کی بہترین عکاسی ان مضامین میں ہوتی ہے جو علامہ شبلی نے لکھے اور اب مقالاتِ شبلی میں وہ یکجا پائے جاتے ہیں۔ ان میں بالخصوص وہ مضامین جو جلد سوم میں یکجا ہیں۔ چونکہ ہر مضمون 'علما' کی نفسیات کے کسی نہ کسی دقیق پہلو کے تجزیئے کے لئے بہت قیمتی مواد فراہم کرتا ہے اور یہ سب ایک ایسے صاحبِ قلم کا تحریر کردہ ہے جس کا شمار انیسویں صدی کے جہابذہ میں ہوتا ہے اس لئے یہ مضامین از اول تا آخر قابلِ مطالعہ ہیں۔ قابلِ ذکر مضامین درج ذیل ہیں:

۱۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

۲۔ مدرسے اور دارالعلوم

۳۔ قدیم تعلیم

۴۔ ملا نظام الدین بانیٔ درسِ نظامی

۵۔ درسِ نظامیہ

۶۔ ندوہ اور نصابِ تعلیم

۷۔ فنِ نحو کی مروّجہ کتابیں

۸۔ تعلیم قدیم وجدید

۹۔ مشرقی کانفرنس

۱۰۔ ریاستِ حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی اور

۱۱۔ احیاءِ علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل (مقالات شبلی: جلد سوم: تعلیمی: سلسلۂ دار المصنفین: طبع دوم 1955)

۸۔ امت کی تاریخ میں 'علما' کا کردار بوجوہ خصوصی تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کون ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ انھیں کس نے پیدا کیا؟ ان کی 'طبع' کہاں سے پیدا ہوئی؟ وہ کہاں سے کسبِ فیض کرتی ہے؟ 'علما' کو کن مقاصد کے تحت پیدا کیا گیا؟

امت کی تاریخ کے مطالعے سے 'علما' کی جو تصویر ابھرتی ہے اسے تین الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے: لفاظی، مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی۔ چنانچہ 'علما' کا حقائق اور تحقیق سے سخت نفور مسلم ہے۔ حقائق سے واقف اور تحقیق کے خوگر لفاظی، مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی کر ہی نہیں سکتے۔ یہی سبب ہے کہ گزشتہ بارہ سو سالوں کا اسلامی علمی اثاثہ (قران اور اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر) لفاظیوں، مبالغہ آرائیوں اور افسانہ طرازیوں کا شاہکار ہے۔ چنانچہ 'علما' کے عزائم، منصوبوں اور کوششوں میں حقائق سے نفور اور لفاظیاں، مبالغہ آرائیاں اور افسانہ طرازیاں بھلا اپنا اپنا رنگ کیوں نہ دکھلاتیں۔ حقائق سے بے خبری اور تحقیق سے نفور 'علما' سے کیسے کیسے غلط اندازے قائم کرواتے ہیں اور ملت کے لئے رسوائیوں کے کیا کیا سامان کرتے ہیں مسلمانوں کی تاریخ اس سے پُر ہے۔ تقریبِ فہم کے لئے تین مثالیں پیش خدمت ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال 'علما' کی اپنے حوالے سے خوش فہمیوں سے متعلق ہے اور دوسری ایسی بے حقیقت لفاظیوں، مبالغہ آرائیوں اور افسانہ طرازیوں کے انجامِ بد سے متعلق اور تیسری 'علما' کی 'حقیقت طبع' سے متعلق:

مثال اول: 'ندوۃ العلما' کے پہلے/دوسرے [خطبات شبلی سید سلیمان ندوی کے مطابق پہلے اور حیات شبلی مصنفہ مصنف ہذا کے مطابق دوسرے اجلاس منعقدہ اپریل 1895 لکھنؤ (صفحہ ۲۵۶)] اجلاس (منعقدہ کانپور ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل 1894) کے پہلے دن مولانا شبلی کی معرکہ آرا تقریر:

قوم کی اخلاقی زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے، قوم کی علمی حالت جس پر ترقی وتنزلی کا مدار ہے، قومی مراسم و دستورات جن سے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی وسعت، بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی ان تمام اوصاف کے سرچشمہ ہمارے علما

(ہیں)۔..........

.......علما کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر تمام علما متفق ہو کر کمر بستہ ہو جائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک یہ خانہ برانداز رسمیں یک لخت معدوم ہو جائیں.........

الحاد و دہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جاتا ہے.......لیکن ہمارے علما اگر معقول طریقہ پر اس کو روکنا چاہیں تو اسی طرح اس کا قلع قمع کر سکتے ہیں جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت امام غزالی، امام رازی، قاضی عضد، ابن رشد نے زندقہ و الحاد کا استیصال کر دیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوا ہوگا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصہ کی فرماں روائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہو سکتے ہیں.........

غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیوں کہ علما جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

''اے حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ یہی ندوۃ العلما جس میں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں، اگر اتفاق و اتحاد کے ٹھیک اصول پر قائم ہو جائے تو کتنی بڑی عظیم الشان طاقت بن سکتا ہے۔''

چنانچہ ۲۴ر اپریل ۱۸۹۴ کو مولانا شبلی نے چار تجویزیں پیش کیں:

پہلی تجویز : موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

دوسری تجویز : تمام مدارس کے مہتممین کا ہر سال ندوۃ العلما میں اجلاس۔

تیسری تجویز : تین دار العلوم (یونیورسٹی) بنا کر سارے ملک کے مدارس کو اس سے مربوط کرنا۔

چوتھی تجویز : مدرسہ فیض عام یعنی مجوزہ ایک دار العلوم کی توسیع میں معاونت۔

مثال دوم: سینتالیس سال بعد (1943) مولانا شبلی، کی 'کامل الاختیار' یعنی 'حضرات علمائے کرام' کی تاثیر اور بنیادی پہلی تجویز کے انجام پر سید سلیمان ندوی کا تبصرہ:

''غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے لئے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں اور سینتالیس برس کے بعد ہم آج اسی وادی

تیہ میں حیران وسرگرداں ہیں۔"

[ملاحظہ فرمائیں: سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، صفحہ ۲۵۵]

مثال سوم: حیرت اور تعجب ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ سے تذکرۃ الرشید مرتبہ مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی نہیں گزری! مولانا عاشق الٰہی کی کتاب 'تذکرۃ الرشید' فروری 1908 میں شائع ہوگئی تھی۔

تذکرۃ الرشید جلد دوم کے آٹھویں حصے میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے معنوی کمالات کا تذکرہ ہے:

''جن دنوں ندوۃ العلماء اپنی ابتدائی شان وشوکت کا دل آویز لباس پہنکر اٹھا اور اہل اسلام نے عموماً اور بھتیرے مخلصین اللہ والوں نے خصوصاً اسکی ضرورت اسکا استحسان اور اسکی خوبیاں تسلیم کر کے شمولیت اختیار کی تھی حضرت امام ربانی نے موافقت نہیں فرمائی ہرچند کہ آپ کی صدارت وسرپرستی پر زور دیا گیا۔ خود مولانا مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوہ یہ درخواست لیکر منظوری کی سعی فرمانے کے لئے گنگوہ کے عازم ہوئے مگر جب دیوبند پہونچے تو حضرت نے کہلا بھیجا کہ ''اس ارادہ سے گنگوہ کا قصد نفرماویں کیونکہ مین شامل ہرگز نہونگا۔ گفتگو جو کچھ کرنی ہو دیوبند مین مولانا محمود حسن صاحب یا سہارنپور مین مولانا خلیل احمد صاحب سے کرلیں''۔ آخر ناظم صاحب کو سہارنپور ہی سے واپس ہونا پڑا اور حضرت یا آپ کے متعلقین شامل نہوے پر نہوے چونکہ ندوۃ العلما کے عالی و بلند ارادوں اور مقاصد عظمیٰ کی اولوالعزمیوں میں اس وقت کسی کو واہمہ یا شک بھی نہیں ہوسکتا تھا اسلئے حضرت کے بعض واقفین نے عرض بھی کیا کہ صاحبزادہ صاحب اور حضرت مولانا دیوبندی کو اجازت عطا فرماوین کہ شریک جلسہ سالانہ ہوجائیں مگر آپ نے بذریعہ تحریر انکو آگاہ فرمایا ''مجھے معلوم کرایا گیا ہے کہ انجام اسکا بخیر نہیں اسواسطے میں اپنی طرف سے کسی کو اجازت نہیں دیسکتا''۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ بھتیرے کام ابتداء مین حسین بنکر ابرتے اور چند روز بعد متغیر ومتنکر ہوکر بیٹھ جاتے ہیں اور اسکا ادراک بہت ہی دقیق بصیرت کا منصب ہے یا کشف و الہام کے ساتھ وابستہ ہے چنانچہ کچھ عرصے بعد مولانا سید محمد علی صاحب کو بھی مستعفی ہونا پڑا اور سنت مصطفویہ کے متمسکین اہل اسلام نے دیکھ لیا کہ جس خاص مضمون کے سبب مسلمانوں کے قلوب ندوہ کیجانب کھنچتے تھے وہ بات اسمیں نہ رہی مبادی کیا تھے اور ثمرات کیا پیدا ہوئے مقصود اور علت غائی کیا تھی اور نتیجہ ومآل کار کیا ظاہر ہوا۔

دیوانہ بہار دید گفتا کہ دے است   در شیشہ گلاب دید گفتا کہ مے است

ہر کس بزبان حال سرے گفتند   جنبیدن ہر کسے از انجاست کہ وے است

[مولانا عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید: جلد دوم صفحہ ۲۰۵ : مطبوعہ ناظم کتبخانہ اشاعت العلوم، محلہ مفتی سہارنپور 1977]

۹۔ مناسب لگتا ہے اس سے متعلق وہ عبارت نقل کر دی جائے جو حامد حسن قادری (1887-1964) نے داستان تاریخ اردو (1938) میں تحریر فرمائی ہے:

''ندوۃ العلما سے تعلق: بعض اہل الرائے ذی علم بزرگوں نے ۱۸۹۴ء (۱۳۱۱ھ) میں علما کی ایک انجمن ''ندوۃ العلما'' کے نام سے قائم کی تھی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں، علمائے ہند کے باہمی اختلاف و نزاع کو رفع کیا جائے اور ایک ایسا دار العلوم قائم کیا جائے جس میں علوم قدیمہ کے علاوہ فنون جدیدہ اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے۔

سب سے پہلے مولوی عبد الغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر نے (جو بعد کو مدار المہام ریاست رام پور ہو گئے تھے) یہ تجویز پیش کی۔ اکثر علما نے تائید کی، اور مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری (خلیفۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف شہروں میں ہر سال اس کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا عبد الحق صاحب دہلوی مؤلف ''تفسیر حقانی' اور مولانا شبلی نے اس کے قواعد مرتب کئے۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا شبلی کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ قائم کیا گیا۔ اس کے ناظم اوّل مولوی سید محمد علی صاحب تھے۔

علامہ شبلی علی گڈھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد ندوۃ العلماء سے خاص دلچسپی لینے اور اس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ مولوی سید محمد علی صاحب کی وفات کے بعد حیدر آباد سے آ کر اس کے ناظم ہو گئے ندوہ کی حالت اس زمانے میں نہایت سقیم تھی۔ گورنمنٹ بدگمان تھی۔ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو چلا تھا۔ مولانا نے ایسی سخت محنت اور ایسی اعلیٰ خدمت کی کہ ندوہ کو از سر نو زندہ کر دیا۔ لیکن علما مولانا کے مذہبی خیالات و عقائد سے مطمئن نہ تھے، ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آخر ان کو بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے دستکش ہونا پڑا۔ مولانا شرر لکھنوی اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا، اور اس زمانے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ علما بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومین امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس زمانے

میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں، اس آیۂ کریمہ لَوْ کَانَ فِیْھِمَا اٰلِھَۃٌ اِلاَّ اللّٰہُ لَفَسَدَتَا۔'' (21:22)[ترجمہ: اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا دوخدا ہوتے تو یہ دونوں ہی تباہ ہوجاتے۔] پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علیگڈھ کالج ہی ہے۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گوانھوں نے ندوہ کو بیحد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔ مگر آخر ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے، جس کا ان کے دوستوں کو بیحد ملال ہوا اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کفِ افسوس ملتے ہوئے مرے۔''

[ملاحظہ فرمائیں: حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو: صفحہ ۲۶ ۷۔۲۸ ۱۹۴۱:]

۱۰۔ سید سلیمان ندوی کی عبارت ''ہم آج اسی وادی تیہ میں حیران وسرگرداں ہیں''—— نہایت 'بلیغ' اور 'پر معنی' ہے۔ عاجز کا خیال ہے کہ اس عبارت کی تشریح پوری ایک کتاب کی متقاضی ہے۔ تاہم اگر کوئی صاحبِ 'ہمت' تذکرۃ الرشید مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی جلد اول میں 'تفقہ وافتاء' کے عنوان کے تحت درج اس مراسلت کی تحقیق کر لے جو مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مابین ہوئی۔ [ملاحظہ فرمائیں: تذکرۃ الرشید جلد اول صفحات: 137-112] تو قوی امید ہے کہ وہ سید صاحب کے مفہوم کو پالے گا۔

۱۱۔ مسلم حکمرانوں کے عہد میں بھی 'علما' کے یہ مدارس مسلمانوں کی محض ان ضرورتوں کی تکمیل کرتے تھے جو پورے 'نظام' کی محض پانچ فیصد ضرورتوں کے برابر تھی۔ مسلم عوام پچانوے (95%) فیصد امورِ حیات میں مکیّف (Conditioned) بنا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ رہی حکمرانی کی ضرورتیں تو انھیں حکمراں خارجی اخذ (Outsourcing) سے پوری کرلیا کرتے تھے۔ امتِ مسلمہ ان سے کلیۃً نابلد اور الگ تھلگ رکھی گئی تھی۔ 1858 کے بعد عظیم مسلم حکمراں معدوم ہو گئے۔ نصف ملت عمودی طور پر منہدم ہو چکی تھی۔ علما عصر اور عصری بحران سے یکسر لاتعلق ہوکر اپنے خودساختہ خول (Cocoon) میں بند ہو گئے اور پوری قوم کو زمانے کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا یا پھر انھیں بھی اپنی طرح عصر اور عصری بحران سے یکسر لاتعلق ہوکر خول (Cocoon) میں بند ہوجانے کی ترغیب دی۔ قوم خارجی طوفان سے زیادہ اس داخلی زلزلے سے بے دم ہو رہی تھی جس کا اسے اب سامنا تھا۔ تیرہ سو سالوں سے مکیّف (Conditioned) رکھی گئی قوم اچانک تکییف سے باہر لادی گئی تھی۔ جیسے کوئی Freezing Point سے اچانک Boiling Point پر لادیا جائے۔ اس قوم کی مثال اس شخص کی طرح ہوگئی تھی جو طویل عرصے تک تاریک تہہ خانے

میں بند ہو جہاں رہتے رہتے برسوں اس نے روشنی کی ایک کرن بھی نہ دیکھی ہو اور اب اچانک سورج کی چلچلاتی دھوپ میں اسے باہر لا دیا گیا ہو۔ اسے کچھ سجھائی دے رہا تھا نہ کسی چیز کو دیکھنے کی اسے تاب تھی۔

۱۲۔ دوسری جانب 'علما' نے سرسید کے خلاف طوفان اٹھا کر اور انھیں زندیق، نیچری اور کافر قرار دے کر مسلمانوں کے 'اصلاحِ احوال' کی ہر راہ بند کر دی۔ سب سے بڑا نقصان اسلام کے 'ارتقائی نظام تعلیم' کو پہنچا جس کی تشکیل کرنے کا منصوبہ سرسید کے پیش نظر تھا۔ مفاہمت، مصالحت اور موافقت کی ہزار کوششوں کے باوجود سرسید علما کو شریکِ کار کرنے یا کم از کم سدِ راہ نہ بننے پر راضی نہ کر سکے۔ 'علما' کی اس ضد نے امت کو ہلاکت سے دوچار کر دیا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے ذریعہ سرسید ''ارتقائی اسلامی تعلیمی نظام'' وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ زمانہ سنت اللہ کے تحت متبدل ہے۔ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ نوح کا بیٹا ہو، لوط کی بیوی ہو یا فرعون! سنت اللہ کی مخالفت سب کے لیے لمحوں میں فیصلہ کن بن جاتی ہے۔

سرسید کے ذہن وفکر میں یہ بات واضح تھی کہ علما کی ضد اور امت میں ان کا رسوخ بالآخر پوری امت کو ہلاکت سے دوچار کر دیں گے۔ چنانچہ سرسید نے سراسر امت کی خیر خواہی میں علما کی ضد کے سامنے سپر رکھ دیا۔ ممکن ہے انھیں علما کے کسی طبقے سے 'حسن ظن' ہو۔ ممکن ہے انھیں عامۃ المسلمین کی سادگی پر ترس آیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کے سر پر ہلاکت کی گھٹا دیکھ کر انھوں نے اپنے منصوبے میں تبدیلی گوارہ کر لی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سرسید نے غیر منظور قوتوں کا ادراک کر لیا ہو۔ بہر حال سرسید اس بات پر راضی ہو گئے کہ 'وحدانی ارتقائی اسلامی تعلیمی نظام' کی بجائے اضافی (Additional) اور تکملی (Integrative) اسلامی تعلیمی نظام پر سر دست اکتفا کر لیں تا کہ عمودی نو ثنویت اور افقی نو ترادفیت پوری طرح عارض نہ ہو جائیں۔

۱۳۔ سرسید کا 'علما' سے 'حسن ظن' عملی اجتہاد تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن وہ 'غلط' 'نادرست' اور 'قرآنی تاریخ' کے خلاف تھا۔ 'علما' ناقابل تبدیل ہوتے ہیں۔ روئے ارض پر اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی 'حکمت' پیدا نہیں کی ہے جو 'علما' کو تبدیل کر دے۔ اب تک صرف 'عذاب الیم' اور 'رُسُل' ہی ان کی 'تادیب' کرتے آئے تھے۔ 'عذاب الیم' جداگانہ امر ہے۔ رہی بات 'رسولوں' کی تو قرآنی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ رسول بھی علما کی 'تادیب' نہیں کرتے۔ وہ انھیں صرف Deauthorized, Desacralized اور Desanctioned کر دیتے ہیں۔ وہ بھی وقتی طور پر۔ 'علما' رسولوں کے سامنے وقتی طور پر بظاہر

Tamed ہو کر لیکن جلد ہی Metamorphosed شکل میں نمودار ہو کر اسی رسول کی سنتوں کو پامال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حکمرانوں کی کیا مجال کہ وہ انبیا کو قتل کرتے۔ ان کے پاس اس کا جواز ہوتا تھا نہ یہ بات ان کے مفاد میں ہوا کرتی تھی۔ انبیا کے قتل کا جواز تو علما فراہم کرتے تھے اور الزام حکمرانوں کے سر جاتا تھا۔ روئے ارض پر معرکۂ خیر وشر اصلاً نام ہے رسولوں اور 'علما' کے مابین معرکے کا۔

ممکن ہے سرسید نے قرآنی آیات ''ارباباً من دو ن الله (التوبہ ۳۱)''، ''سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم (البقرہ ۶)'' اور ''ولا تکونوا اول کافر به (البقرہ ۴۱)'' کی کوئی قابلِ فہم تاویل کی ہو۔ مگر اس کا کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ 'علما' اپنی ضد پر قائم رہے۔ ان کی 'ضد' نے امت کو ہلاکت سے دوچار کر دیا۔

۱۴۔ عاجز کی ناقص رائے میں سرسید کے رویے یعنی ان کا انقباض (Withdrawal)، ان کی مفاہمت (Compromise) اور ان کا حسنِ ظن (Favourable Opinion) خلافِ حکمت تھے۔ 'مفاہمت' کسی منصوبے کا ستون نہیں بن سکتی۔ یہ ایک تدبیر ہے اور اس کا استعمال صرف قلیل المدت منصوبوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی محض Surgical Operation کے بطور، خواہ اثباتی مقصد کے لئے ہو یا سلبی مقصد کے لئے۔ طویل المدت منصوبوں (Long Term Planning) میں 'مفاہمت' خودکشی کے مترادف ہے چہ جائے کہ طویل الطویل منصوبوں (Perspective Planning) میں اس کا استعمال۔ سرسید کی منصوبہ بندی طویل منصوبہ بندی (Long Term Planning) کب تھی؟ وہ تو Perspective Planning تھی۔ ایسی منصوبہ بندی میں انقباض، مفاہمت اور حسنِ ظن صد فی صد بے معنی ہیں۔

ان نامساعد حالات سے جن میں سرسید گھر چکے تھے، نکلنے کی، عاجز کی رائے میں، صرف دو ہی راہیں تھیں:

۱۔ اندرونی انقباض (Internal Withdrawal) — اور

۲۔ تعبیری حرکیت (Virtual Mobilization)۔

اندرونی انقباض (Internal Withdrawal): سرسید کو اپنے منصوبے کے حوالے سے صد فی صد استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ ایسے حالات میں انھیں ہر قسم کی مفاہمت کو کلیۃً رد کرتے ہوئے عملی اقدامات کرنے چاہیئے تھے۔ بلاشبہ ان عملی اقدامات میں وہ 'اندرونی انقباض' (Internal

(Withdrawal) کے منہج (Methdology) پر عمل کرتے۔ عاجز کی رائے میں وہ مدرستہ العلوم یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عملی قیام کے اقدامات نہ کرتے بلکہ تفکیر، تدبیر اور تعمیل میں سے تدبیر اور تعمیل کو آنے والے دنوں کے لئے اٹھا رکھتے اور صرف تفکیر پر اپنی بقیہ زندگی کھپا دیتے۔ آنے والی نسلیں اس تفکیر کی روشنی میں تدبیر اور تعمیل کرتی رہتیں۔ عاجز کی رائے ہے کہ 661 عیسوی کے بعد امتِ مسلمہ میں 'عملی تفکیر' کرنے والا ایسا عبقری جیسا سرسید تھے پیدا نہیں ہوا۔ کاش 'عملی تفکیر' کا کام وہ پورا کر جاتے۔

تعبیری حرکیت (Virtual Mobilization): بصورتِ دیگر سرسید کو اپنے منصوبے کے حوالے سے صدفی صد استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برصغیر کو خیر آباد کہہ کر یوروپ بالخصوص لندن منتقل ہو جانا چاہیئے تھا۔ سرسید کا یہ عمل نبی آخر الزماں ﷺ کے تتبع میں ویسا ہی عمل ہوتا جیسے ہجرت۔ آنحضور ﷺ بیت اللہ چھوڑ کر یثرب چلے گئے تھے۔ خواہ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی اسی منصوبے کو روبہ عمل لاتے لیکن لندن، پیرس یا برلن میں۔ ان کے لئے لندن سب سے مناسب جگہ تھی۔ عاجز کے خیال میں سرسید کو لندن میں اور سید محمود کو کیمبرج یا آکسفرڈ میں مستقل سکونت اختیار کر لینی چاہیئے تھی۔ کاش ایسا ہو جاتا تو دنیا کی صورت قطعاً وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

عاجز کی رائے ہے کہ اگر ان دونوں راہوں میں سے کوئی راہ بھی سرسید اختیار کر لیتے تو امت مسلمہ کی تاریخ کا یہ 'عبقری بروز' اس کرب ناک اذیت اور المیے سے دو چار نہ ہوتا جس سے سرسید، سید محمود اور سر راس مسعود دو چار ہوئے۔

۱۵۔ عاجز اب تک تاریخ میں واقع ہونے والے اس قسم کے 'حدوث' (Eventuation) کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر ایسا کیوں کر ہو جاتا ہے یا ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ عاجز حیران ہے کہ غالبؔ سے بھی ویسی ہی اجتہادی غلطی (؟) سرزد ہوئی۔

۱۔ کاش اسد اللہ خاں 11-1810 میں اکبر آباد سے نقل مکانی کر کے دہلی میں آباد ہونے کی بجائے کلکتہ جا کر آباد ہو جاتے — یا

۲۔ کاش مرزا غالبؔ 27-1826 میں اپنے مقدمات کی پیروی کے بہانے کلکتہ جانے کی بجائے لندن چلے جاتے۔ یا

۳۔ مرزا غالبؔ نے 1858 میں قاطعِ برھان لکھ کر 1862 میں لکھنؤ سے چھپوایا۔ کاش انہوں نے یہ کتاب لندن میں لکھی اور وہیں سے چھپوائی ہوتی۔

مضمرات وعواقب

ا۔ یوں تو 1858 کے بعد زندگی کے ہر میدان میں اور معاشرے کی ہر سطح پر ہندوستان میں مسلمان اس عمودی نوثنویت (Vertical Neo-Dichotomy) کے طوفان کے تھپیڑے کھانے لگے تھے لیکن 1870 آتے آتے حالات بے حد سنگین اور راسخ ہو گئے۔ سرسید کے مدرسۃ العلوم اور اینگلو محمڈن اورینٹل کالج کے قیام کی تحریک روایتی عمودی ثنویت (Traditional Vertical Dichotomy) اور روایتی افقی ترادفیت (Traditional Horizontal Dualism) سے زیادہ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کی مزاحمت کا شکار ہوگئی۔ عاجز کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرسید اس بات سے کیسے بے خبر رہے یا باخبری کے بعد اسے کیوں کر نظر انداز کر دیا کہ ان کی مخالفت میں عمودی نوثنویت اور افقی نو ترادفیت آ کھڑی ہوئی ہیں اور روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی تمام قوتیں بھی ان کے مخالفین کا ہی ساتھ دے رہی ہیں اور ان کے پیچھے صف آرا ہیں۔ مثلاً:

ا۔ سرسید کی سب سے پہلی مخالفت اس اولین کمیٹی کے ارکان نے کی جن میں سمیع اللہ خاں اور میر اکبر علی تھے۔ یہ دونوں اشخاص عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے نمائندے تھے اور تا حیات رہے۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی تمام قوتیں ان کے ساتھ ہمہ دم ان کی پشتیبان رہیں۔

۲۔ سرسید کی دوسری مخالفت ان دو افراد کی جانب سے ہوئی جنھیں سرسید کے دست ہای چپ و راست کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اٹاوہ کے نواب محسن الملک محمد مہدی علی اور امروہہ کے نواب وقار الملک مشتاق حسین۔ یہ دونوں افراد بھی عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے نمائندے تھے اور تاحیات رہے۔ لیکن یہاں بھی روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی تمام قوتیں ان کا ہمہ دم ساتھ دیتی رہیں۔

۳۔ سرسید کی تیسری مخالفت ان دو افراد کی جانب سے ہوئی جنھیں علی بخش خاں اور سید امداد علی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ دونوں اشخاص بھی عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے نمائندے تھے لیکن یہاں بھی روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی ساری قوتیں ان کا ہمہ دم ساتھ دیتی رہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ان دونوں افراد کو برطانوی حکومت نے حسنِ کارکردگی کے لئے نوازا۔ حکومتِ برطانیہ نے سید امداد علی کو 'سر' کا خطاب عطا کیا اور سب جج علی بخش کو انگریزی تعلیم عام کرنے کے صلے میں خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔

اپنے قیام (1875) سے آج تک مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اسی صورتحال کا بدترین شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ گزشتہ ایک سو سینتس سال میں ہمیشہ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت اس کے مٹانے کے درپے رہیں اور روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی تمام قوتیں ان کی پشتیبان بن کر ان کا ساتھ دیتی رہیں۔

سرسید کی 'ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کی تحریک کے —— جس کا اساسی تجربہ گاہ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج تھا اور اب مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہے —— کم از کم چار ادوار شمار کئے جا سکتے ہیں:

ا۔ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا پہلا دور (1875-1920)

۲۔ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا دوسرا دور (1920-1947)

۳۔ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا تیسرا دور (1947-1970)

۴۔ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا چوتھا دور (1970-2012)

۲۔ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کے پہلے دور (1875-1920) کے زمینی حقائق اور مسلم جواب عمل کے نتائج:

الف۔ عمودی ثنویت اور افقی ترادفیت کا طبقہ (مدرسہ جاتی طبقہ):

۱۔ متشددانہ اور مکمل منفی اور سلبی رویہ کا اظہار۔

۲۔ حصول علم و حصول معلومات کے عصری ذرائع سے مکمل انقطاع یعنی Potential اور Actual استعداد سے کلی صرفِ نظر۔

۳۔ 'ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' وضع کرنے کی تحریک یعنی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا مکمل بائیکاٹ۔

۴۔ عمودی ثنویت اور افقی ترادفیت کے نمائندہ طبقے میں موجود چند فہیم اشخاص سے مدارس کی مکمل تطہیر۔

(الف) ندوہ تحریک کی کم از کم تین مرحلوں میں تطہیر، مولانا احمد رضا خاں کی مخالفت، مولانا رشید احمد گنگوہی کا بائیکاٹ، مولانا شبلی کا اخراج اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ندوہ سے رخصت ہونا۔

[ملاحظہ فرمائیں:]

۱۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا: سیر المصنفین محولہ حامد حسن قادری: تاریخ زبان اردو۔

۲۔ پروفیسر محمد مجیب: The Indian Muslims: London, 1967 آخری چھ ابواب۔

۳۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی: دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

۴۔ سید سلیمان ندوی: مکاتیب شبلی جلد اول: بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔

(ب) مدرستہ الاصلاح کا مقاطعہ، ذمہ دارانِ مدرسہ کے رجوع اور علماے دیو بند کو یقین دہانی کے بعد مدرستہ الاصلاح کی حلقۂ علما میں جزوی قبولیت اور تشفی نامہ کا اجرا۔

۵۔ عوام، متوسط اور اعلیٰ طبقات بالخصوص ارباب حل و عقد حتی کہ سرخیل اکابرِ ملت کی عصری حالات، حوادث، واقعات، تزویرات، فکری جہتوں اور ملکی، قومی اور عالمی پالیسیوں سے مکمل بے خبری۔ پوری ملت کا لاعلمی کے خود ساختہ (Cocoon) میں بند ہو جانا۔

۶۔ مقامی، علاقائی، ملکی، عالمی تبدیلیوں، فکری، علمی، تحریکاتی کشمکش، سیاسی، علمی، معاشی اور ثقافتی انقلابات سے مکمل بے خبری کے نتیجے میں حوادث اور ان کی پیش بینی اور پیش

بندی کے حوالے سے مکمل بے حسی۔ اکابر ملت کے ذریعہ قوم کو غلط آگہی کی فراہمی۔ نادرست رویوں کا اظہار۔ غیر عملی اور جذباتی اقدامات اور ردعمل۔ نتیجۃً بدترین ناکامیاں، ذلت، کرب ناکی اور بے بسی۔

(ب) عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ (عصری علوم کا طبقہ بالخصوص اینگلو محمڈن اورینٹل کالج):

۱۔ اسلامی علوم اور معلومات کی گہری واقفیت رکھنے والی ہستیوں کی فکری اور علمی کاوشوں کا متنازعہ فیہ بن جانا۔

۲۔ ایسی ہستیوں کے متنازعہ فیہ بن جانے سے قوم کے حساس لوگوں کے بڑے طبقے کا بھی حیص بیص میں مبتلا ہوجانا اور اس صورتحال میں مسلمانوں کا متحدہ اور منظم فیصلہ کرنے کی قوت، صلاحیت اور امکانات سے عاری ہوجانا۔

۳۔ سرسید، چراغ علی اور نذیر احمد جیسے عبقری اہل علم کی فکری اور خلاقانہ تخلیقات کے بہاؤ کا رک جانا۔

۴۔ حالی کی 'مسدس' جیسی عظیم اور عدیم النظیر تخلیق کا متنازعہ فیہ بن جانا۔ حالی جیسی عبقری، فکری اور علمی شخصیت کے فکری اور علمی انفجار کا ٹھٹھر کر رہ جانا۔

۵۔ سرسید، حالی، چراغ علی اور نذیر احمد کی اولین خلاقانہ تخلیقات کے رک جانے سے ثانوی اور ثلثی تخلیقات یعنی تزکیۂ مزید (Refinements) کے امکانات کا ہمیشہ کے لئے ختم ہوجانا۔

۶۔ ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کی تحریک کا ختم ہوجانا۔

۷۔ علما کی مخالفت کے پیش نظر خود 'ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کے علم برداروں کے ذریعہ اضافی اور تکملی اسلامی نظام تعلیم کے اختیار کرلینے سے اسلامی علوم و معلومات کے اولین ماخذ تک تبدیلیٔ سطح (Change of Scale) کے ذریعۂ رسائی کی ساری استعداد، امکانات اور مواقع سے محروم ہوجانا۔

۸۔ اس صورتحال میں متجانبی قوتوں اور جذبوں کے تعامل سے رفتہ رفتہ گہرے اسلامی علوم سے عدم واقفیت میں اضافہ ہوجانا۔

۹۔عصری علوم کے اداروں میں ایسے مسلم خواص (Muslim Elite) کی نئی نسل کی نمائندگی میں اضافہ ہو جانا جو اسلام، اسلامی حیات اور اسلامی حیویت کے گہرے امور سے جزوی باخبری یالاعلمی کے سبب نیم بے حسی کا شکار ہو چکی تھی۔

۳۔عمودی ثنویت اور افقی ترادفیت کے دوسرے دور (1920-1947) کے زمینی حقائق اور مسلم جواب عمل کے نتائج:

ا۔عمودی ثنویت اور افقی ترادفیت کا طبقہ (مدرسہ جاتی طبقہ):

ا۔متشددانہ اور مکمل منفی اور سلبی رویہ کا اظہار کرنا۔

۲۔حصول علم اور حصول معلومات کے عصری اور ہمہ دم ترقی پذیر ذرائع سے مکمل انقطاع یعنی Potential اور Actual استعداد سے کلی صرف نظر کرنا۔

۳۔ ہمہ دم اور سرعت کے ساتھ متبدل عصری حالات اور حوادث، ان کی تفصیلات، پس منظر، منظر ناموں، Data، Facts، ان کے مضمرات اور عواقب کے ادراک اور فہم کی Potential اور Actual استعداد سے مکمل طور پر محروم ہو جانا۔

۴۔عوام، متوسط اور اعلیٰ طبقات بالخصوص ارباب حل وعقد حتی کہ معروف اکابر ملت کا عصری حالات، حوادث، واقعات، تزویرات، امکانات، ممکنات، ظاہر، ظہور پذیر اور زیر آب فکری جہتوں، ملکی، قومی، عالمی پالیسیوں سے مکمل بے خبر ہونا اور پوری ملت کا لاعلمی کے خول (Cocoon) میں بند ہو جانا۔

۵۔عوام، متوسط اور اعلیٰ طبقات بالخصوص ارباب حل وعقد کا حقائق پر مبنی اور قابلیت عمل (Feasibility) کے حامل ملی منصوبوں، ان کو روبہ عمل لانے کی استعداد اور معلوم و لامعلوم مزاحمت کے پیش نظر اس کی متبادل صورتوں سے خالی الذہن ہونا۔

٦۔علما کا عامۃ المسلمین کو غلط اطلاعات، تعبیرات اور تصریحات کر کے گمراہ کرنا۔

۷۔علما کی غلط اطلاعات، تاویلات، تعبیرات اور تصریحات کے سبب مسلمانوں کی ہمہ دم اور سرعت کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والے حوادث پر مکمل بے حسی۔ ان حوادث کے تعلق سے منصوبوں، استعداد اور توجیہ سے قطعاً عاری اور خالی الذہن ہونے کے سبب نادرست، منفی، سلبی، رجعی اور جذباتی رویوں کا اظہار اور اسی کے زیر اثر اقدامات اور

ردعمل۔ نتیجۃً بدترین ناکامیاں، تصادم، تزاحم، ذلت، کرب ناکی، کسر وانکسار اور بے بسی کا طاری ہونا۔

۸۔ علمی میدان میں اسلامی علوم اور اس کی گہرائی اور گیرائی سے مکمل انقطاع۔ اسلامی علوم کی نمائندگی کرنے والے طبقے کی خود اسلامی علوم سے مکمل لاعلمی۔ اسلامی علمی ذخائر، ماخذ، منابع اور مصادر اور بالخصوص اولین مصادر سے لاعلمی۔ علما کی تخلیقات کا حقائق، شعور اور فکر کے اعتبار سے ازحد سطحیت، لفاظی، جذباتیت اور غیر سنجیدگی کا شکار ہوجانا۔ ہندوستان کے طول وعرض میں بکھرے لاکھوں مصادر سے مکمل غفلت اور بے اعتنائی چنانچہ ان کا ضائع ہوجانا۔

۹۔ اسلامی اور مسلم معاشرت کا عملاً ختم ہوجانا۔

۱۰۔ علما کے ذریعہ اسلام کے 'الدین عند اللہ الاسلام' ہونے، آنحضور ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے اور اسلام کے کائناتی، آفاقی، انسانی، ملی، مللی اور عالمی ہونے کے احساسات اور ان کے تقاضوں کے مطابق اعمال وآداب سے مکمل دست برداری۔

۱۱۔ اس کے برعکس محدود ترین، غیر اسلامی، غیر انسانی، غیر اخلاقی، عصبیتی، فرقہ وارانہ مسلکی اور مشربی خود ساختہ اسلام سے مکمل وابستگی، یک جہتی اور ہم آہنگی۔

ب۔ عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ (عصری علوم کا طبقہ بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ):

۱۔ 'ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کی تشکیل کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس کے عزم، خاکوں اور تصور کا مکمل خاتمہ ہوجانا۔

۲۔ علی گڑھ تحریک یعنی عصری علوم حاصل کرنے کے پرعزم اور بامقصد جذبے کا مکمل خاتمہ۔

۳۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فکری (Ideological) اور جہتی (Accelerative & Directional) خلا (Chaos) نتیجۃً فکری پراگندگی اور ژولیدہ فکری۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس خلا (Chaos) کو پر کرنے کے لئے متعدد خارجی فکری اور جہتی قوتوں اور افکار کا بزور وتزویر داخلہ (Gatecrash, Break-in and Breaking & Entering)۔

۵۔ مختلف فکری جہتوں کی کشاکش کی صورت میں ردعمل۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک کا

آغاز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے علیحدگی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سیاسی قوتوں کے Cross Current کے نرغے میں۔ نتیجۃً ارتجالی، ارتجاعی اور ارتدادی ردعمل۔

[ملاحظہ فرمائیں:]

۱۔عبدالغفار مدہولی: جامعہ کی کہانی: مطبوعہ کونسل برائے فروغ اردو زبان 2004: اس کتاب کا پہلا باب اس صورتحال کی بہترین عکاسی کرتا ہے جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

۲۔ پروفیسر محمد مجیب: خانہ جنگی 1976۔

۳۔ڈاکٹر ذاکر حسین: کچھوا اور خرگوش: نیشنل بک ٹرسٹ 1970۔

۴۔ پروفیسر محمد مجیب: ہندوستانی مسلمان: بطور خاص آخری باب: تتمہ: مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو: اردو ترجمہ۔

۵۔ پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: خدابخش لائبریری جرنل: 50: 1989۔

۶۔ پروفیسر مجیب رضوی: پیچھے پھرت کہت کبیر کبیر..... اور دوسرے مضامین: دلی کتاب گھر: دہلی 2009۔

یہ چھ کتابیں/مضامین جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

۶۔عصری تعلیم گاہوں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے فارغین میں اولین اسلامی اور اولین مشرقی علوم تک رسائی دلانے والے علوم اور ان کے فہم کی استعداد کا فقدان۔

۷۔عالمی اور مغربی ذرائع علوم سے بڑھتی ناواقفیت، چنانچہ عصر حاضر اور بالخصوص مغرب کو جاننے کے لئے ثانوی اور ثلثی ذرائع پر تکیہ کرنا۔ مغرب کے ناقص (Corrupt)، Edited اور Tailored علم (Bullshit Stuff) تک رسائی۔

۸۔مغرب کے ثانوی اور ثلثی ذرائع کے Exposure کے سبب اسلام بیزاری، سطحی اور طفلانہ نوعیت کی مغرب پسندی کا ظہور۔

۹۔علوم وفنون کے تمام شعبوں میں ایجابی وسلبی، مثبت ومنفی اور ردوقبول ہر شش جہات کے اعتبار سے اعلانیہ، غیر اعلانیہ اور زیر لب شعوری اور تحت شعوری طور پر مغرب کو کسوٹی

سمجھ لینا۔

۱۰۔اسلام کے جزوی اور روایتی فہم اور مغرب کی سطحی واقفیت کے سبب مغربیت [مغربی نیشنلزم (Western Nationalism)، فیبین سوشلزم (Fabian Socialism)، اشتراکیت (Socialism)، اشتمالیت (Communism)، نہیلزم (Nihilism)، الحاد (Athiesm) اور اباحیت (Epicureanism)] کا ظہور۔

۱۱۔عصری علوم سے وابستہ طبقے اور مراکز کا انتشار ذہنی اور ژولیدہ فکری کا نگار خانہ بن جانا۔

بہ حیثیت مجموعی ان حوادث کے سبب مدرسہ جاتی اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہر دو طبقات کے زیر اثر پوری امت کا ذہنی، دماغی، فکری، علمی، تجرباتی، عملی اور اخلاقی طور پر پہلے Second Fiddle بن جانا۔ اور کچھ ہی دنوں میں حالات کے جبر سے ان کا پوری طرح Trifle، Trivial اور Chattel بنا دیا جانا جس کا استعمال کبھی Scapegoat کے بطور ہوتا تو کبھی بزکشی کی بکری کی طرح۔

۴۔عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے تیسرے دور (1947-1970) کے زمینی حقائق اور مسلم جواب عمل کے نتائج:

(الف)

(۱) عمودی ثنویت اور افقی ترادفیت کا طبقہ (مدرسہ جاتی طبقہ):

۱۔ بر سر زمین حقائق کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۲۔اسلامی علوم (دین اللہ کے علوم) کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۳۔ مذہبی، مسلکی اور مشربی اسلام سے مکمل طور پر وابستہ ہو جانا۔

۴۔ علانیہ، غیر علانیہ، خاموش اور بالواسطہ ارتداد کی طرف چلا جانا۔

۵۔ مذہبی، مسلکی اور مشربی اسلام سے وابستہ طبقے کا نئے حالات میں تشخص کے لئے رسوم کی افزائش کا سہارا لینا۔

۲۔عمودی نوثنویت اورافقی نوترادفیت کا طبقہ (عصری علوم کا طبقہ بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ):

ا۔ برسرزمین حقائق کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہوجانا۔

۲۔اسلامی علوم کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۳۔اسلام دین اللہ اور اسلام مذہب کے جوہری فرق کی تمیز سے لاعلم ہوجانا۔

۴۔مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا عدیم النظیر Shock کی گرفت میں چلا جانا۔ اس کی Psyche پر غیر معمولی اثرات کا مرتب ہونا:

(الف) پہلے Psyche کا Inversion میں چلا جانا۔

(ب) پھر Inversion کا Inanimation کا روپ دھار لینا۔

(ج) پھر Inanimation کا Insulation میں بدل جانا۔

(د) پھر Insulation کا Hibernation میں بدلتا ہوا محسوس ہونا۔

(ہ) پھر Hibernation کا Introversion میں بدل جانا۔

(و) پھر Introversion کا Delirium میں بدل جانا۔

۵۔اسی عدیم النظیر Shock کے زیر اثر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے بعض شعبوں کی نفسیات کا Delirium سے بدتر ہوکر Delirium Tremens کی حالت میں چلا جانا۔ بعض شعبوں کے بعض افراد کا Nerdish ہو جانا۔ یہی وہ زمانہ (1947-1970) تھا جب ملت اسلامیہ میں بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں بالخصوص ان دونوں طبقات (عمودی ثنویت اور افقی ترادفیت کا طبقہ اور عمودی نوثنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ) کے باہم عمل اور ردعمل نے مسلمانوں میں ایک مخصوص قسم کی جینیاتی قلب ماہیت (Genetic Modification) کے عمل کا آغاز کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں امت مسلمہ کی عصری نسل مقلوب ہوکر (Genetically Modified) ایک نئی نوع (Specie) بن گئی۔ جینیاتی طور پر مقلوب (Genetically Modified) اس نوع (GMS) سے دو ذیلی انواع (Sub-Species) ظہور پذیر ہوئیں:

۱۔ اس جینیاتی مقلوب نوع (GMS) سے ظہور پذیر ہونے والی پہلی ذیلی نوع (Sub-Specie) کا نام تھا مشرقی خواص کی نسل [Generation of Eastern Strands (GES)]۔

۲۔ اس جینیاتی مقلوب نوع (GMS) سے ظہور پذیر ہونے والی دوسری ذیلی نوع (Sub-Specie) کا نام تھا مغربی خواص کی نسل [Generation of Western Strands (GWS)]۔

(ب)

۱۔ مشرقی خواص کی نسل (GES): یہ پہلی جینیاتی مقلوب نوع (GMS) تھی جس کا غالب عنصر ایسے افراد یا پس منظر رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا جو مذہبی ثقافت سے وابستہ تھے۔ یہ جینیاتی مقلوب نسل (GMS) کلیۃً Vulgarised نسل کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کے اثرات Overactive Vector کی طرح نئی نسل میں سرایت کر گئے۔ اس جینیاتی مقلوب نسل (GMS) نے آناً فاناً اپنے زیر اثر آنے والے ہر فرد اور اجتماعیت کو عمودی اور افقی ہر دو اعتبار سے Vulgarised کر کے رکھ دیا۔ اس جینیاتی قلبِ ماہیت (Genetic Modification) میں سب سے بڑا رول ان دو تحریکوں کا ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں ظاہر ہوئیں۔ یہ دو تحریکیں تھیں مولانا محمد الیاس کاندھلوی (1884-1944) کی 'تبلیغی جماعت' (1927) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979) کی 'جماعت اسلامی' (1941)۔ چونکہ 'تبلیغی جماعت' وسعت، حرکیت اور عمومیت کے اعتبار سے 'جماعتِ اسلامی' سے ہر اعتبار سے فائق تھی اس لئے اس کا دائرۂ اثر جماعت اسلامی سے بہت وسیع، عریض، عوامی اور ہمہ گیر ہو گیا۔ برصغیر کی امتِ مسلمہ میں سب سے مہلک اثرات اسی قلبِ ماہیت (Genetic Modification) کے برآمد ہوئے۔ امت کا بڑا حصہ ان کے زیر اثر Vulgarised ہو کر اس قابل ہو گیا کہ خود اسلام کی تشکیل جدید کر ڈالے۔ چنانچہ ان کے ذریعہ اسلام کی تشکیلِ جدید کر دی گئی۔ اسلام دینِ آخرت (Islam the way towards Future) کی بجائے اسلام دینِ عاجلت (Islam the way for the Present) بن کر رہ گیا۔ حال

(Present) سرے سے کوئی مدت نہیں بلکہ اس نقطے اور کیفیت کا نام ہے جہاں اور جب مستقبل ماضی میں بدل جاتا ہے۔ ایک کیفیاتی لاشئ (Nothingness) کا نام حال ہے۔ حال سے وابستہ افراد اور قومیں ایسی بے جان حاشیہ نشین (Marginalised) اشیا کی مانند ہیں مثلاً شاہراہ کے کنارے پڑے پتھر جن کے بالکل پاس سے یا جن کو روندتے ہوئے وقت کا قافلہ گزر جاتا ہے۔ بالخصوص 'تبلیغی جماعت' نے اپنے متاثرین کے Genome میں قرآن وسنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے Gene کو پوری طرح Neuiralise کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ امت کی کثیر آبادی کھلی ذہنی دناءت کی طرف راغب ہوگئی۔ 'جماعت اسلامی' نے اس کیفیت کو دو آتشہ کر دیا۔ چنانچہ اس کے دو متخالف اور عجیب وغریب مظاہر سامنے آئے۔ 'تبلیغی جماعت' بظاہر Monolithic برقرار رہی جب کہ 'جماعت اسلامی' Trivium بن گئی۔

۲۔ **مغربی خواص کی نسل (GWS):** یہ دوسری جینیاتی مقلوب نوع (GMS) تھی جس کا غالب عنصر ایسے افراد یا پس منظر رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا جو دوسرے اور تیسرے درجے کے مغربی ذرائع اور مصادرِ علم سے مستفید اور از حد متاثر تھے۔ یہ جینیاتی مقلوب نوع (GMS) کلیتہً Lumpenized نسل کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ان کے اثرات بھی Overactive Vector کی طرح نئی نسل میں سرایت کر گئے۔ اس جینیاتی مقلوب نسل (GMS) نے آناً فاناً اپنے زیرِ اثر آنے والے ہر فرد اور اجتماعیت کو عمودی اور افقی ہر دو اعتبار سے Lumpenized کر کے رکھ دیا۔ لیکن اس کے بدترین اثرات عمودی کم اور افقی زیادہ برآمد ہوئے۔ اس جینیاتی قلبِ ماہیت (Genetic Modification) میں سب سے قابل ذکر رول ان تین تحریکات کا ہے جن کا آغاز بیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہوا۔ یہ تین تحریکات تھیں:

۱۔ تحریکِ نیشنلزم (Movement of Nationalism)

۲۔ تحریکِ سوشلزم (Movement of Socialism)

۳۔ تحریکِ کمیونزم (Movement of Communism)

برصغیر میں بڑی تعداد میں آباد دو مذاہب کے ماننے والوں۔۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نئی

نسل یکساں نہیں تھی۔ گزشتہ دوسو سالوں میں بوجوہ ان دونوں کے مابین بہت بڑا فرق واقع ہو چکا تھا۔ بالخصوص وہ فرق جو ان دونوں کی اشرافیہ اور اعلیٰ طبقات کے مابین واقع ہوا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات معاشرتی اور معاشی اعتبار سے تقریباً یکساں تھے لیکن ذہنی، فکری اور علمی اعتبار سے دو مختلف انواع بن چکے تھے۔ وہ ایک ہی معاشرے میں پڑوسیوں کی طرح رہتے اور بعض اوقات اور بعض افراد ایک جیسے تعلیم گاہوں میں پڑھتے لیکن ان سب باتوں کے باوجود دو الگ الگ سطحوں کے حامل ہو چکے تھے۔ یہ تبدیلی آنے والے دنوں میں بڑی دوررس نتائج کی حامل ہوئی جس کا ادراک سر سید کے علاوہ شاید ہی کسی نے کیا تھا۔ گزشتہ دوسو سالوں میں ان دونوں مذاہب کی نئی نسل میں درج ذیل تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں:

۱۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل Highbrow ہو چکی تھی۔ جب کہ نئی اعلیٰ مسلم نسل ابھی تک Lowbrow تھی۔

۲۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل Intellektuelle ہو چکی تھی۔ وہ Geistig تھی۔ Zeitgeist سے وہ باخبر تھی۔ چنانچہ اب وہ Wißbegierig تھی۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل کا علمی طبقہ Weltliteratur سے مربوط ہو چکا تھا۔ اس کے احساسات اب Weltmannisch تھے۔ انھوں نے اپنی قوم اور Weltgeschichte کے مابین نقاط التقا اور سطح ارتباط ڈھونڈ لیا تھا۔ لہذا پوری قوم Weltgewandt ہو چکی تھی۔ ان کے اعلیٰ دماغ Weltbekannt ہوکر Weltmacht کے اندرونی Strands سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔

۳۔ اس کے بالکل برخلاف نئی اعلیٰ مسلم نسل اب تک Lumpig تھی۔ وہ انفرادی اعتبار سے Lumpenpack اور اجتماعی اعتبار سے Lumpensammler تھی۔ نئی اعلیٰ مسلم نسل بحیثیت مجموعی Geistlos تھی۔

۴۔ نئی متوسط ہندو نسل Middlebrow ہو چکی تھی جب کہ نئی متوسط مسلم نسل ابھی تک Conditioned تھی۔

۵۔ نئی پس ماندہ ہندو نسل Receptive ہوکر Reciprocator ہو چکی تھی۔ جب کہ نئی پس ماندہ مسلم نسل Retardant تھی۔

۶۔نئی اعلیٰ ہندونسل میں پیدا ہونے والے عباقرہ —— پوری قوم میں معروف ہی نہیں بے حد مقبول ہو چکے تھے۔ اس کے برخلاف نئی اعلیٰ مسلم نسل میں پیدا ہونے والے عباقرہ یا تو مسلمانوں میں غیر معروف رہے یا ملعون، مردود، زندیق اور کافر قرار دے دیئے گئے۔ اس طبقے میں تمام مسلم عباقرہ کا شمار ہو سکتا ہے جن میں غالبؔ، سرسید، حالیؔ اور اقبالؔ سر فہرست ہیں۔ غالبؔ، سرسید اور حالیؔ اگر عنادلِ گلشنِ ناآفریدہ ہیں تو اقبالؔ کے چھ خطبات 'ورقِ ناخواندہ' اور 'لفظِ ناشنیدہ'۔

نئی متوسط ہندونسل کا Middlebrow ہو جانا اس 'عظیم انقلاب' کا بنیادی سبب تھا جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ نئی متوسط ہندونسل میں درج ذیل باتیں ظہور پذیر ہوئیں:

۱۔وہ دیکھتے دیکھتے Repertoire اور Repository بن گئی۔

۲۔نئی متوسط ہندونسل رضا کارانہ طور پر نئی اعلیٰ نسل کے لئے بالعموم اور اپنے عباقرہ کے لئے بالخصوص Transponder کا کردار ادا کرنے لگی۔

۳۔نئی متوسط ہندونسل Transmitter، Translator اور Transliterator کا کردار ادا کرنے لگی۔

۴۔بعض اوقات حسبِ ضرورت نئی متوسط ہندونسل نے Transmuter کا کردار ادا کرنے میں بھی دیر نہیں کی۔

۵۔بعض اوقات حسبِ ضرورت نئی متوسط ہندونسل نے اس سے آگے بڑھ کر Replicator کا کردار تک ادا کر دیا۔

۸۔نئی متوسط ہندونسل کے برخلاف نئی متوسط مسلم نسل حسب سابق 'Conditioned' رہی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں میں مغربی خواص کی نسل (GWS) تین تحریکوں —— نیشنلزم، سوشلزم اور کمیونزم کے ذریعہ جینیاتی قلب ماہیت (Genetic Modification) کا نتیجہ تھی۔ یہ تینوں طبقات ارتجاعی (Reactive) تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہیئے کہ اس انبوہ میں شامل سارے اذہان یکساں نہ تھے۔ ان میں بعض اہلِ علم اور سنجیدہ، بعض اہلِ علم مگر جذباتی، بعض کم علم مگر سنجیدہ، بعض کم علم اور اس پر مستزاد بے حد جذباتی، بعض جذباتی اور مجرد ارتجاعی (Reactionary)

لیکن اکثر ذہین اور حساس تھے۔ ممکن ہے ان کا ایسا ردِعمل مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آرہے 'عمودی شنویت' اور 'افقی ترادفیت' کے ناروا رویوں کے سبب ہو جو یقیناً اسلام کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے اور ایسا رویہ اختیار کرنے میں وہ حق بجانب بھی ہوں لیکن ان کا مغربی رجحانات (نیشنلزم، فیبین سوشلزم، کمیونزم، ڈیماکریسی، سیکولرزم، ترقی پسندی، اباحیت اور الحاد) سے ہم آہنگ ہو جانا محض سطحی (Superficial)، ثانوی (Secondary) اور ثلثی (Tertiary) پروپیگنڈا لٹریچر (Propagandistic Literature) سے متاثر ہو کر تھا۔ ان میں گہرائی نہ تھی۔ عاجز کو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس طبقے کے ذہین، صاحب علم اور حساس لوگوں کو التباس ہو گیا۔ دور سے آرہی آوازیں انھیں مانوس لگیں اور وہ اس کے گرویدہ ہو گئے جب کہ وہ آوازیں خود ان کے اندرون سے نکلے ھمس کی بازگشت تھیں۔ ان طبقات میں شامل مسلم افراد میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے مغرب کا عمیق و ہمہ گیر مطالعہ کیا ہو۔ یہ افراد لاکھ مخلص سہی لیکن عاجز کے علم کی حد تک ان میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو مغرب کے عمیق و ہمہ گیر مطالعہ کی قوتی استعداد (Potential Capability) کا حامل ہو۔ یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ جب کسی میں قوتی استعداد (Potential Capability) ہی مفقود ہو تو پھر اس کی حقیقی استعداد (Actual Capability) زیر بحث ہی نہیں آتی۔ چنانچہ ان افراد میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو ان علوم سے براہِ راست واقف ہو جن میں مغرب میں عہد وسطی اور مابعد عہد وسطی میں ہونے والے واقعات و حادثات کے اولین ماخذ اور ان میں پایا جانے والا Source Material محفوظ و مخزون ہیں۔ مثلاً یونانی، کوئی، لاطینی، بطریقی، پروینکل، اطالوی، عبری وغیرہ۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن کی اپنی اپنی خصوصیات اور پیچیدگیاں اور رعایات ہیں جن سے واقفیت کے بغیر سولہویں، سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مغرب میں ہونے والے جملہ واقعات و حوادث کا ادراک کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی کے آخر تک کا عرصہ مغرب بالخصوص مغربی مغرب یعنی جرمن، فرنچ اور اینگلو سیکسن علاقے (Germanic, French and Anglo-Saxonic Regions) میں علمی انفجار (Intellectual Explosion) کا نقطۂ کمال ہے۔ چنانچہ اس عہد کے علمی انفجار کو حقیقی معنوں میں ہضم (Digest) کرنے

اور اس کا درست ادراک کرنے کے لئے کم از کم دس عالمی رتاریخی زبانوں کا گہرا علم درکار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہندوستان کی نئی اعلیٰ اور متوسط مسلم نسل میں سرے سے یہ صلاحیت مفقود تھی۔

[ملاحظہ فرمائیں: مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنی احوال جاننے کے لئے]

۱۔ پروفیسر محمد مجیب: ہندوستانی مسلمان: باب ۲۲۔ ۲۳۔

۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی جوہر کی ڈائری۔

۳۔ ڈاکٹر محمد حسن: غمِ دل وحشتِ دل: تخلیق کار پبلیشرز، دہلی 2003

یوں تو ڈاکٹر حسن کی کتاب اس عہد میں مسلم نوجوانوں کی ذہنی سطح اور ان میں پائی جانے والی کشمکش کی بہترین عکاس ہے۔ تاہم اس کے ابواب: شہر طرب رومانوں کا، ایک انوکھا سفر، بازگشت، مشعلوں کا جلوس ناقابل فراموش ہیں۔

(ج) حقیقی سرزمین پر مسلمانوں کی مکمل راندگی (Expulsion):

مسلمانوں میں ان دونوں جینیاتی مقلوب نسلوں (GMS's) یعنی مشرقی خواص نسل (GES) اور مغربی خواص نسل (GWS) کے ظہور نے دو احوال پیدا کئے جن میں اول الذکر داخلی تھا اور آخر الذکر خارجی۔

۱۔ داخلی تعامل: ان دونوں طبقوں میں اول الذکر مشرقی خواص نسل (GES) نے ایک جانب بالعموم عوام کو اور بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوان نسل کو مکمل طور پر Vulgarised کر کے رکھ دیا تو ثانی الذکر مغربی خواص نسل (GWS) نے دوسری جانب بالعموم متمول اور اعلیٰ طبقات کو اور بالخصوص متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ مسلم نسل کو مکمل طور پر Lumpenised کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی ملت کے تعلیم یافتہ افراد کے نوے فیصد انسانی وسائل (Human Resources) Vulgarised اور Lumpenized ہو کر بالکل مفلوج ہو گئے جس کے سبب پوری ملت ژولیدہ فکر اور Paralysed ہو کر رہ گئی۔

۲۔ خارجی تعامل: دنیا میدان حوادث (Arena of Events) ہے جہاں مسلسل اور بے شمار حوادث ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سی قوتیں، ان کے افکار اور استعدادیں باہم متعامل ہو کر ہر لمحہ Cross-Curren[ts] کا سماں پیش کرتی ہیں جن کے Criss-Cross سے نئے نئے حوادث جنم لیتے [ر]ہتے ہیں۔ دو قوتوں، ان کے افکار اور استعدادوں کے صدمے پہلے Collateral اور پھر

Multilateral اثرات ڈالتے ہیں جن سے ایسی ظاہرات وجود میں آتی ہیں جو Multiplex ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ افراد اور قوموں کے لئے ہر لمحہ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ ہر لمحہ ان کی بقایا فنا کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ چنانچہ افراد ہوں یا اقوام انھیں ہر لمحہ مستعد اور برسرِ عمل رہنا ناگزیر ہے۔ اس میدانِ عمل میں Second Fiddle بن جانے پر راضی ہوجانا موت کی جانب سفر کو سرعت عطا کر دیتا ہے۔ اس میدان حوادث میں تماش بینی خودکشی کے مترادف ہے۔ سست گامی ناقابل معافی جرم ہے۔ مجرم کو کچل دیئے جانے کی سزا ملتی ہے۔

بدقسمتی سے امت مسلمہ ان تینوں جرائم کی مرتکب ہوگئی۔ چنانچہ Second Fiddle بننے، تماش بینی کرنے اور سست گام ہونے کی اسے سزا دی گئی۔ ہر میدان میں مسلم قوم Marginalized کر دی گئی۔ تاریخ کا ہر فیصلہ معقول (Rational) ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ انھیں تاریخی فیصلوں کی ایک جہت ہے:

"Marginalized قوم کے عواقب"۔ یہ عواقب اٹل ہیں:

''تاریخ کسی حاشیہ نشین (Marginalized) قوم کو باعزت طور پر زندہ اور محفوظ رہنے کی اجازت نہیں دیتی''۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر حال میں اس کا سبب معاندت (Hostility) ہی ہو۔ روئے زمین اور اس پر موجود مستقر اور متاع 'قلیل' (Scarce) ہیں۔ لہٰذا تسابق (Competition) یہاں ایک فطری 'ظاہرہ' اور 'تقاضا' ہے۔ ہمہ دم اور ہمہ گیر جاری اس تسابق (Competition) کے سبب Marginalized قوم بے رحمی سے کچل دی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حادثہ امت مسلمہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ امت زندگی کے ہر میدان میں بے رحمی سے کچل ڈالی گئی۔

۵۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے چوتھے دور (1970-2012) کے زمینی حقائق اور مسلم جوابِ عمل کے نتائج:

عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے چوتھے دور کا آغاز ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک 'فتنے' کے ظہور کے ساتھ ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس 'فتنے' کے ظہور نے تیسرے دور کا خاتمہ اور چوتھے دور کا آغاز کر دیا۔ اس 'فتنے' کا نام ہے ''ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے کا بہ حیثیت مجموعی پیٹرو ڈالر سوسائٹی'' (Petro-Dollar Society) میں تبدیل ہوجانا۔ ملت کے افق اور منظر نامے پر اس کا ظہور

'صبح کاذب' کی طرح تھا جسے حاشیہ نشیں (Marginalized) اور روند ڈالی گئی (Trampled) ملت اسلامیہ نے 'صبح صادق' مان لیا۔ اس 'فتنے' نے پوری ملت کی بچی کھچی 'حیویت' (Vitality) کے پرخچے اڑا دیئے۔ یہ 'فتنہ' مشرق وسطی میں 'تیل کے استعماری استعمال' (Colonial use of oil) سے پیدا ہوا۔ مشرق وسطی میں 'تیل کا استعماری استعمال' خود اس 'فتنے' کا حصہ تھا جسے فتنۂ عظیم' (The Great Trial) کہا جاتا ہے۔ اس 'فتنے' (تیل کے استعماری استعمال) کے مقاصد تھے:

۱۔ مشرق وسطی میں چچا ٹام (Uncle Tom) پیدا کرنے کی نرسری کا قیام۔

۲۔ مشرق وسطی میں ایسی معلق معیشت (Hanging Economy) کا قیام جس کے اندر معاشیات، عمرانیات اور تاریخ کے کسی اصول کی کارفرمائی نہ ہو۔

۳۔ مشرق وسطی میں تعبیری معاشرہ (Virtual Society)، تعبیری ثقافت (Virtual Culture) اور بالآخر تعبیری ریاست (Virtual State) کا قیام۔

چنانچہ اس 'فتنے' (تیل کا استعماری استعمال) کی خصوصیات تھیں:

۱۔ معاشی، عمرانی اور تاریخی اصولیات، تدریج، ترجیحات اور ان سے متعلق اصولیات کی صریح خلاف ورزی کا ماحول۔

۲۔ فکری، علمی، تجرباتی، فنی اور ادارہ جاتی اصولیات، تدریج، ترجیحات اور ان سے متعلق اصولیات کی صریح خلاف ورزی کا ماحول۔

۳۔ علم، فنون، اہل علم وفن اور علم وفن کی قدروں کی صریح ناقدری۔

۴۔ پہلے مشرق وسطی میں پھر اس سے راست مربوط دنیا میں انسانیت اور معاشرت نہاد علم اور ثقافت (Humanity & Society-Based Knowledge & Culture) کی بجائے مالی منفعت نہاد علم اور ثقافت (Monetary Earning Based Knowledge & Culture) کا انفجار۔

چنانچہ اس 'فتنے' کے ظہور کا براہ راست اثر ہندوستانی مسلمانوں پر بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند مسلم انسانی وسائل پر بالخصوص ہوا۔

۱۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند بالخصوص جوق در جوق بلکہ فوج در فوج مشرق وسطی منتقل ہونے لگے۔

۲۔ اس کے جلو میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد بالعموم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد بالخصوص اکثر براہ مشرق وسطی اور بعض براہ راست امریکہ منتقل ہونے لگے۔

۳۔ ہندوستان کے حقیقی میدانِ عمل سے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد میں ظاہر ہونے والا نقل مکانی (Migration) کا یہ عمل نیا اور مہلک تھا۔ اس سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں نے تین تاریخی 'نقل مکانی' کا تجربہ کیا: پہلا: دہلی پر نادر شاہ کے حملے سے سقوطِ دہلی کے مابین (1737-1804) ۔ دوسرا: 1857 کے بعد اور آخری: 1947 کے بعد۔ یہ تینوں اجتماعی نقلِ مکانی ازروئے حقیقت اندرونی نقل مکانی (Internal Migration) تھے۔ مشرق وسطی میں 'تیل کے استعماری استعمال' کے نتیجے میں ظاہر ہونے والا نقل مکانی اندرونی نہیں بلکہ عملاً خروج (Exodus) تھا۔ اس خروج میں کئی مہلکے پنہاں تھے۔

۴۔ پہلی مہلک بات یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد کا یہ خروج (Exodus) غیر مستعد (Unprepared) غیر منصوبہ بند (Unplanned)، متعین ومتوحد مقصد سے عاری (Without identified & unified objective) اور بے ہدف (Untargetted) تھا۔

۵۔ دوسری مہلک بات یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد کا یہ خروج (Exodus) عملاً آزادی سے نوغلامی (Neo-Slavery) کی طرف ہوا۔ مشرق وسطی میں 'تیل کے استعماری استعمال' کے اصل ذمہ داروں نے اپنے تاریخی رویوں کے عین مطابق نو غلامانہ معاشرت (Neo- Slavery Society) کی بنا ڈالی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوستان کی جمہوری اور آزاد فضا سے اپنا Brain Drain کر کے وہاں کی نو غلامی کو قبول کر لیا۔ وہ آزاد جمہوری اور دستوری ہندوستان سے جہاں تاریخی اور قانونی طور پر وہ متمکن (Established) تھے رضا کارانہ نقل مکانی کر کے انھوں نے اس ماحول کو قبول کر لیا جہاں انھیں کوئی تاریخی اور قانونی حقوق حاصل نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ چالیس سالوں سے ایک ایسی نسل ان کے یہاں پروان چڑھ رہی ہے جو روئے زمین پر ایک تعبیری شہری (Virtual Citizen) کی طرح ذہنی، فکری، جذباتی اور قانونی طور پر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خود نقل مکانی کرنے والے یہ مسلمان وہاں رہتے رہتے ذہنی، فکری، علمی اور عملی طور پر ایک غلام ریاست (Slave State) اور غلاموں کی تجارت (Slave Trade) کا جز بن کر رہ

گئے ہیں۔

۶۔ تیسری بدترین بات یہ ہے کہ نقل مکانی کرنے والے ایسے تعلیم یافتہ اور ہنر مند مسلمان ہندوستان میں عملاً بیخ کندہ (Uprooted & Exterminated) ہو گئے۔ ان کے گھروں میں پیدا ہونے والی نسل تو اب ذہنی طور پر بھی بیخ کندہ (Uprooted & Exterminated) ہو کر اس جذبے سے بھی عاری ہو چکی ہے جو کم از کم ان ابتدائی نقل مکانی کرنے والوں میں یاد ماضی (Nostalgia) کی صورت میں اب بھی باقی ہے۔

۷۔ چوتھی بدترین بات یہ ظہور پذیر ہوئی کہ پیٹروڈالر سے سیراب مگر ہندوستان میں رہ جانے یا کما کر لوٹ آنے والے گھرانوں نے ایک نئے نقل مکانی (Migration) کو جنم دے دیا۔ یہ نقل مکانی ہندوستان کے گاؤں اور قصبوں سے مسلمانوں کا شہروں بالخصوص بڑے شہروں (Metros) میں جا کر آباد ہو جانا ہے۔ چنانچہ دائمی بندوبست [Permanent Settlement(1785-93)]، رعیت واری نظام [(Ryotwari System) (1820-27)]، محال واری نظام [(1815-22) (Mahalwari System)] کے اجرا اور حصول آزادی کے بعد Land Reform Acts سے بیخ کندہ آبادی کے بچے کھچے مسلمان اس بار رضا کارانہ (Voluntarily) طور پر ہندوستان کے گاؤں، قصبوں اور تحصیلوں سے Evaporate اور Vanish ہونا شروع ہو گئے۔

۸۔ پانچویں بدترین بات یہ ظہور پذیر ہوئی کہ شہری علاقوں (Urban Areas) میں نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کے لئے منظم آبادکاری (Planned Settlement) بوجوہ ممکن نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو خود ان کی Vulgarised غالب طبع اس کا ابا کرتی لہٰذا شہری علاقوں میں نقل مکانی کرنے والی اس آبادی نے ہندوستان کے شہروں میں آباد مسلمانوں میں ایک نئے معاشرے کا آغاز کیا ہے جسے (Slum & Ghettoe Culture) کہا جا سکتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والے افراد خواہ متمول ہوں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ وہ اب ایک ہی قسم کے (Slum & Ghettoe Culture) کا حصہ بن گئے ہیں اور ان آبادیوں میں ایک ایسی نسل پروان چڑھ رہی ہے جو خواہ کسی پبلک اسکول میں ہی تعلیم کیوں نہ حاصل کر رہی ہو وہ اسی کلچر کا حصہ ہے۔

۹۔ پچھلے چالیس سالوں سے پیٹروڈالر سے مستفید گھرانوں میں ایک تیسری قسم کی جینیاتی مقلوب نسل (GMS) کا ظہور ہوا ہے جو Mediocre Generation کی طرح اب جوان ہو چکی ہے۔ یہ

نسل (Generation) طبعاً Mimetic ہو کر بے لگام Mimicry پر برسرِ عمل ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے یہ نسل بدترین طور پر غیر خلاق (Uninnovative) ثابت ہو گی۔ چنانچہ آنے والے عہد کا مسلم معاشرہ اس کی ذہانت کا کارگاہ ہو گا جس کے تصور سے ہول آتا ہے۔ یہ مضمحل (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanized) نسل تیزی سے پھیلتی اور بے قابو ہوتی جا رہی ہے۔

۶۔ پچھلے سطور میں جس 'فتنۂ عظیم' (The Great Trial) کا ذکر کیا گیا وہ کیا ہے؟

بلاشبہ یہ 'فتنۂ عظیم' نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یا غزوۂ اَحزاب کے بعد پیدا ہونے والے 'فتنۂ عظیم' کا مثنیٰ اور تکرار ہے۔ عہدِ رسالت کا وہ 'فتنۂ عظیم' جو (۱) فتح خیبر (۲) فتنۂ منعِ زکوٰۃ (۳) فتنۂ اِرتِداد (۴) فتنۂ بنی سَقِیفہ (۵) فتنۂ فِدَک (۶) فتنۂ قادِسیّہ (۷) فتنۂ بیتِ المقدس (۸) فتنۂ عراق، یمن و مصر (۹) فتنۂ دمشق، کوفہ و بصرہ (۱۰) فتنۂ جبر و قدر (۱۱) فتنۂ خوارِج (۱۲) فتنۂ کربلا (۱۳) فتنۂ حَرّہ (۱۴) فتنۂ وَلاء (۱۵) فتنۂ مَوالیٰ (۱۶) فتنۂ اہل تَسوِیہ (۱۷) فتنۂ عَصَبِیّہ (۱۸) فتنۂ شُعُوبِیّہ (۱۹) فتنۂ مُرجِیہ (۲۰) فتنۂ مُعتَزِلہ (۲۱) فتنۂ خلقِ قرآن و کلام وغیرہ کے لامتناہی سلسلہ کی صورت میں ظاہر ہوا ایک بار پھر اس کا مثنیٰ اس کی تکرار کر رہا ہے۔

یہ 'فتنۂ عظیم' دورویہ شاخسانہ (Two-Branched Phenomenon) کی صورت میں ظاہر ہوا۔ 1453 سے زیرِ زمین برسرِ عمل یہ فتنہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں برسرِ زمین آ گیا۔

اٹھارہویں صدی میں اس کے تین مقاصد اور اہداف تھے:

۱۔ رَخبۂ عُبُوری کا حصول

۲۔ رَخبۂ مُستَقِل یعنی مَثابہ کا حصول

۳۔ دونوں کے 'حصول' کے لئے Potential اور Actual استعداد کا حصول۔

1453 سے وہ تیسرے ہدف تک رسائی کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے مرکز المراکز مغربی یوروپ میں تھے۔ اس ہدف کے حصول میں انہوں نے عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ ان منصوبوں کے پہلے ہدف کا حصول 1776 میں ہو گیا۔ دوسرے ہدف کے حصول کا باضابطہ آغاز 1779 سے ہوا۔ دوسرے اور بنیادی تیسرے ہدف کے حصول کے لئے کی جانے والی جدوجہد اور اس کے باریک لطیف اور دقیق خطوط کی بہترین تشریح برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے اپنی کتاب The Arabs in the History: 1950 میں کی ہے:

"Islam to-day stands face to face with an alien civilization that challenges many of its fundamental values and appeals seductively to many of its followers. This time, the forces of resistance are stronger....... But if the metal is harder, so too is the hammer-for the challenge of today is incomparably more radical, more aggressive, more pervasive - it comes not from a conquered, but a conqureing world. The impact of the West, with its railways and Printing-presses, aeroplanes and cinemas, factories and universities, oil-prospectors and archaeologists, machine-guns and ideas, has shattered beyond repair the traditioal structure of economic life, affecting every Arab in his livelihood and his leisure, his private and public life, demanding a readjustment of the inherited social, political and cultural form.

In these problems of readjustment the Arab peoples have a choice of several paths; they may submit to one or other of the contending versions of western civilization that are offered to them, merging their own culture and identity in a larger and a dominating whole; or they may try to turn their back upon the West and all its works, pursuing the mirage of a return to the lost theocratic ideal, arriving instead at a refurbished despotism that has borrowed from the West its machinery both of exploitation and repression and its verbiage of intolerance, or finally — and for this the removal of the irritant of Western tutelage is prerequisite — they may succeed in renewing their society from within, meeting the West on terms of equal co-operation, absorbing something of both its science and humanism, not only in shadow but in substance, in a harmonious balance with their own inherited tradition." (Page- 177-178)

۷۔ رجبہ مستقل یعنی مثابہ کا حصول ان کا مقصد اصلی تھا۔ اس ہدف کے باضابطہ اور متعین خطوط کار کے ساتھ حصول کی کوششوں کو کم از کم دو ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ماقبل 1948 کا دور

۲۔ مابعد 1948 کا دور

ان دونوں ادوار میں حصول ہدف کی کوششیں دو توجیہات (Orientations) سے روبہ عمل لائی گئیں:

۱۔ اندرونی یا داخلی کوشش

۲۔ بیرونی یا خارجی کوشش

اندرونی یا داخلی کوشش کے تحت اندر موجود داخلی قوتوں کو متحرک کر کے ہدف تک پہنچنے کی سعی کی گئی جب کہ بیرونی یا خارجی کوشش کے تحت باہر موجود خارجی قوتوں کو متحرک کر کے ہدف تک رسائی حاصل کی گئی۔ اندرونی کوشش سے کم از کم چار ایسے مقاصد کا حصول کیا گیا جو مثابہ کے حصول کے لئے ناگزیر تھے۔ یہ چار مقاصد تھے:

۱۔ عربوں کی تادیب جدید کرنا

۲۔ فارس اور عرب کے مابین تفریق جدید کرنا

۳۔ ترک اور عرب کے مابین تفریق کرنا

۴۔ فتنۂ عصبیۃ اور فتنۂ شعوبیہ کا احیا کرنا

بیرونی کوشش کے کم از کم تین مقاصد تھے:

۱۔ مشرقِ وسطیٰ میں تعبیری معاشرہ (Virtual Society)، تعبیری ثقافت (Virtual Culture) اور تعبیری ریاست (Virtual State) قائم کر کے تعبیری نظام (Virtual Order) قائم کرنا۔

۲۔ تعبیری معاشرہ، ثقافت اور ریاست کے قیام کے پیش خیمہ کے بطور نظام مال یا نظام فتنۂ مال قائم کرنا اور معلق معیشت (Hanging Economy) قائم کرنا۔

۳۔ بالآخر رجبہ مستقل یا مثابہ قائم کرنا۔

اندرونی یا داخلی کوشش صدفی صدامت میں موجود ان سے وابستہ اندرونی قوتوں نے انجام دیں۔

چنانچہ خلافت کا خاتمہ (1924) اور مدینت کے قیام (1948) میں علمائے یہود کے بعد سب سے اہم اور فیصلہ کن رول خود 'علمائے اسلام' اور 'ذمہ داران مدارس' نے ادا کئے۔ اگر ہندوستان، وسطی ایشیا، ترکی، مصر، افغانستان، ایران، شام اور جزیرۃ العرب کے 'علمائے اسلام' اور 'ذمہ دارانِ مدارس' نے موثر رول ادا نہ کیا ہوتا تو خلافت کا خاتمہ ہوتا اور نہ 'مثابہ' کا قیام۔

تاریخ کا دقیق تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ انیسویں صدی میں سرسید ان اہداف کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ (Hindrance) تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان، افغانستان، ایران، شام اور مصر کے علما نے ان کے خلاف طوفان برپا کر دیا اور بالآخر سرسید اور ان کے فقید المثال بیٹے اور پوتے کی زندگیاں وحشتناک المیوں میں بدل کر رہ گئیں۔

۸۔ 1948 میں رحبۂ مستقل یا مثابہ قائم ہو گیا۔ لیکن ہدف کا حصول ابھی عبوری اور مجازی تھا۔ ابھی اس کے استقلال اور بقا کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ چنانچہ مابعد 1948 کا مرحلہ انھیں اہداف کے حصول کے لئے شروع کیا گیا۔

ا۔ یہ ساری تگ و دو غیر معمولی طور پر خلاقانہ (Innovative) رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق وسطی میں دو تہوں میں لپٹے دو قسم کے معاشرے تلے اوپر تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ یہ دو معاشرے ہیں:

ا۔ نظام مال یا فتنۂ مال پر مبنی عربوں کا صارفی معاشرہ (Consumeristic Society) — اور

۲۔ سارے مشرق وسطی میں اعلیٰ ترین خلاقانہ تعبیری معاشرہ (Highly Innovative Virtual Society)۔

ان دونوں معاشروں میں جوہری فرق ہے۔ دونوں یکساں عنوان سے لیکن اپنے اپنے اہداف پورے کر رہے ہیں جن میں جوہری فرق ہے۔ مثلاً ایک جانب جہاں مشرق وسطی کی عرب یونیورسٹیوں میں علم (Knowledge) اور خلاقیت (Innovation) کے سوا ہر چیز پائی جاتی ہے۔ وہیں دوسری جانب اسی مشرق وسطی میں تعبیری طور پر قائم ہونے والی یونیورسٹیاں جہاں علم (Knowledge)، تفوق (Excellence) اور خلاقیت (Innovation) کے سوا کسی شئے کی طلب ہے نہ قدر۔ عربوں کی قائم کردہ یونیورسٹیاں ہیبتناک المیوں (Horrible Tragedies) کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پوری بیسویں صدی انہوں نے ضائع کر دی۔ المیہ یہ ہے کہ رحبۂ مستقل کا ہدف رکھنے والے ہی عربوں کے موجہین تھے اور ہیں۔ انہوں نے عربوں کو پوری بیسویں صدی کے دوران مجبور کیا کہ وہ نو غلامانہ نظام (New

(Slavery System) کا باضابطہ احیا کریں۔ ظاہر ہے اس کا مقصد ان اندیشوں کا سد باب کرنا تھا کہ عالم عرب میں مطلوب باہر سے آنے والے مسلم اہل علم اور ہنر مند وہاں کی آبادی کا حصہ نہ بن جائیں تاکہ ان کے اصلی ہدف کے پورا ہونے میں دقت ہو۔ بلکہ ایسے مسلمان اہل علم اور ہنر مند وہاں آکر علمی و فنی اعتبار سے ضائع اور طبعاً غلام ہو جائیں۔ اب جب کہ وہ اس معاشرے کو پوری طرح صارفی معاشرہ (Consumeristic Society) بنا چکے ہیں وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ خارجی اہل علم اور ہنر مند جو دراصل غیر مسلم ماہرین علم و فن ہیں وہاں بس کر اس معاشرے کو Irreversible بنا ڈالیں۔

ان تمام اہداف کے حصول میں 'علمائے اسلام' اور 'ذمہ داران مدارس' نے موثر اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔

۹۔ یہ پورا پیراڈائم (Paradigm) حرفاً حرفاً ویسا ہی ہے جیسا نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سو سالوں تک امت کو درپیش ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسی پیٹرن (Pattern) کی تکرار ہونے جا رہی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں ظاہر ہونے والے فتنوں نے جس طرح اسلام دین اللہ اور امت مسلمہ کو مقلوب (Modified) کر کے رکھ دیا تھا ٹھیک اسی طرح اب تک ظاہر ہونے والے فتنوں نے مشرق وسطیٰ میں موجود امت مسلمہ کو بالخصوص اور پورے عالم میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو بالعموم مقلوب (Modified) کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ 'فتنۂ عظیم' آئندہ اپنے نوع اول (Prototype) سے سینکڑوں گنا زیادہ بھیانک اور قیامت خیز ہوگا۔

دین اور مذہب

۱۔ 661 عیسوی کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں فکر و عمل کی روایت کا تجزیہ قابل ذکر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اور اس میں لحہ بہ لحہ واقع ہونے والے حوادث اور ان میں امت کے تعامل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ چودہ سوسالوں سے تکلیف (Conditioning) کے سبب مسلمانوں کی 'طبع' تین عناصر سے عبارت ہو چکی ہے:

۱۔ پیش بینی مخالف(Anti-Foreseeing)

۲۔ خلاقیت مخالف(Anti-Innovative) اور

۳۔ پیش قدمی مخالف(Anti-Initiative)۔

ان تینوں طبائع کا اللہ کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام دین الآخرۃ ہے — یہ آخرت کا دین ہے۔ چنانچہ مسلم تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان تینوں مہلک رجحانات کے راسخ ہو جانے کے سبب انفرادی اور اجتماعی مسلم ذہن (Mind) اور عملیت (Practice) ماضی جماد (Past-Stuck) ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ ان چاروں عناصر (پیش بینی مخالف، خلاقیت مخالف، پیش قدمی مخالف اور ماضی جماد) سے مل کر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کارکردگی بھی۔۔ تفکیر، تدبیر اور تعمیل کے میدانوں میں پس رو (Follower)، پھسڈی (Lagging)، مجبور پس رو (Limping)، قدریہ جست مخالف

(Anti-Quantum Jump) اور تبدیلِ مدرج مخالف (Anti-Change of Scale) ہو کر غیر روایتی تسابق مخالف (Anti-Overtaking by Change of Scale or Quantum Jump) ہو چکی ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی اس چہارگانہ تاریخی، ذہنی اور عملی روایت کا منبع (Source)، اس کی اصل (Root)، اس کا مجری (Passage)، اس کے موجّہ (Regulator or Director) اور مشرف (Overseer) فی الواقع 'علما'، ان کی طبع، ان کا تعامل اور ان کے ادارے رہے ہیں جو حقیقی (Actually) اور تعبیری (Virtually) ہر دو اعتبار سے ساری امت کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک 'علما' کی اصل 'طبع' کا سوال ہے تو وہ ایک پیچیدہ 'روایت' اور اس سے پیدا شدہ 'نفسیات' کا نتیجہ ہے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

661 عیسوی کے بعد جو اسلام نافذ العمل کیا گیا وہ درحقیقت عین وہی اسلام —— دین اللہ نہیں تھا جسے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی آدم کو پہنچایا اور ان کے درمیان اسے عملاً متمکن کیا تھا۔ 661 عیسوی کے بعد کا اسلام کچھ اور تھا۔ اس کے تار و پود کا جائزہ اور اس کے DNA کا تجزیہ بتاتے ہیں کہ یہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی تشکیل جدید (Replication, Re-modeling & Reconstruction) تھا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حادثے کی خبر دیتے ہوئے فرمایا تھا:

۱۔ عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى عليه وسلم : بدأ الاسلامُ غريباً و سيعودُ كما بدأ فطوبى للغرباء (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوھریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام اجنبیوں کی طرح آیا اور وہ اجنبی کی طرح پلٹے گا۔ پس خوش قسمتی ہے اجنبیوں کے لئے۔

۲۔ لتتبعن سنن الذين من كان قبلكم، شبراً شبراً ذراعاً ذراعاً (رواه البخاري باب اعتصام الكتاب والسنة)

ترجمہ: تم (مُلا) ان کے نقش قدم پر چل کر رہو گے جو تم سے پہلے ہوئے، ایک ایک بالشت ایک ایک ہاتھ۔

۳۔ عن عبد الله ابن عمر و قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليأتين على امتي كما أتى على بني اسرائيل حذو النعل بالنعل......(ترمذي)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرو نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: میری امت میں بھی وہی صورتحال طاری ہوگی جیسی بنی اسرائیل پر ہوئی تھی، ایک قدم کے بعد دوسرا قدم۔

۴۔ عن عبداللہ بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: تدور رحی الاسلام لخمس و ثلثین اوست و ثلثین او سبع و ثلثین فان یھلکوا فسبیل من ھالك وان یقم لھم دینھم یقم لھم سبعین عاماً قلتُ أمِمّا بقیٰ أو مِمّا مطیٰ؛ قال مَطیٰ۔ (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام کی چکی پینتس یا چھتیس یا سینتس سال چلتی رہے گی۔ اور ہلاک ہو گئے تو یہ ہلاک ہونے والے کا راستہ ہے اور اگر یہ قائم رہے تو ان کا دین ستر سال ان کے لئے قائم رہے گا۔ میں نے پوچھا: باقی سے یا گزرے ہوئے سے؟ فرمایا: گزرے ہوئے سے۔

چنانچہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا اسلامی نظام ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ستر سالوں کے اندر اندر اسلام ہی کے نام سے 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کی تشکیل جدید ہو چکی تھی۔ چنانچہ یہ اسلام مذہب (ربیائی نو یہودیت) سابقہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی طرح ہی خدا مخالف: توحید مخالف: (Anti-Allah)، رسول مخالف: رسالت مخالف (Anti-Rasulullah) اور قرآن مخالف: ھدی مخالف (Anti-Divine-Guidance) تھا۔ اصل دینِ اسلام کی جگہ جاگیر اس نوساختہ اسلام مذہب کی حقیقت کی وضاحت کے لئے ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی تشریح اور تنقیح ضروری ہے۔

۳۔ موسوی دین کی تاریخ میں متعدد موڑ آئے:

۱۔ موسوی دین (1500 B.C.) :

۲۔ داؤدی دین (1000 B.C.) :

۳۔ عزیری دین (500 B.C.) :

۴۔ سوفری دین (135 B.C.) :

سوفری دین کے آغاز (135 B.C.) کو عام طور پر 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کا سالِ آغاز مانا جاتا ہے جب کہ حقیقت ایسی نہیں۔ درحقیقت عزیری دین کا آغاز (500 B.C.) ہی

'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کا آغاز ہے۔'ربیائی یہودیت' کی تشکیل کرنے والا ایوان انشی کِنِصِّتْ ھَجَدُولَہْ (אנשי כנסת הגדולה) 400 قبلِ مسیح میں معرضِ وجود میں آچکا تھا۔تاہم اصل سُوفرِیمْ (סופרים) 150 قبل مسیح میں باضابطہ وجود میں آئے۔یہی 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) 'فریسی یہودیت' (Pharisaic Judaism) بھی کہلاتی ہے۔

'ربیائی یہودیت' کے تین ستون ہیں۔ اس کے تینوں ستون جس قاعدہ یا اساس (Foundation) پر کھڑے ہیں اسے 'عطا کردہ' (Given) یعنی نتون (נתון) کہا جاتا ہے۔یہ تینوں ستون درج ذیل ہیں:

ا۔خود کفیلِ عبادت: اس کا مفہوم ہے عبودیت اور عبادت میں خود مختار ہونا۔'ربیائی یہودیت' کے اسی ستون کی حقیقت خدا مخالف: توحید مخالف (Anti-Allah) ہے۔

۲۔خود کفیلِ اطاعت: اس کا مفہوم ہے اطاعت میں خود مختار ہونا۔'ربیائی یہودیت' کے اسی ستون کی حقیقت رسول مخالف: رسالت مخالف (Anti-Rasulullah) ہے۔

۳۔خود کفیلِ ھدایت: اس کا مفہوم ہے ہدایت میں خود مختار ہونا۔'ربیائی یہودیت' کے اسی ستون کی حقیقت تورہ مخالف: ھدیٰ مخالف (Anti-Torah) ہے۔

۴۔'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کے دو مصادر یا منابع (Sources) تسلیم کئے جاتے ہیں:

ا۔'مکتوب قانون' (Written Law): اس مکتوب قانون کو مکتوب توراۃ یا تورۃ سَبِکْتُبْ (תורה שבכתב) بھی کہا جاتا ہے۔اس میں مجموعی اعتبار سے 613 احکام درج ہیں جن میں 248 اوامر اور 365 نواہی ہیں۔انھیں '613 احکام' (תרי"ג מצוות) بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔'زبانی قانون' (Oral Law): زبانی یا سینہ بسینہ منتقل ہونے والے اس قانون کو توراتِ دہن یعنی تورۃ سَبِعَلْ پِہ (תורה שבעל פה) بھی کہا جاتا ہے۔بعض حلقوں میں اسے دَبَّرْ ھَمَشُورَہْ لَلِبْ (דבר המסורה ללב) بھی کہا جاتا ہے۔بعض حلقے اسے قَبَلَہ (קבלה) کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔درحقیقت زبانی یا سینہ بسینہ منتقل ہونے والے اس قانون کا مفصل نام ھَلَکْھَہ لِمِشْنیٰ مِسْ سِیْنیٰ (הלכה למשנה מסיני) یعنی — 'وہ مِشْنیٰ جو سِیْنَا میں عطا کیا گیا' ہے۔

'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کے مطابق مکتوب قانون — تورہ۔مکتوب

الواح کی شکل میں موسیٰ کو اِلُوھِیمْ (אלוהים)، یَہْوَہْ (יהוה) یا اَدُوْن (אדון) نے عطا کئے تھے۔

اسی طرح 'ربیائی یہودیت' کے مطابق زبانی یا سینہ بسینہ آج منتقل ہونے والا یہ 'زبانی قانون' (Oral Law)—— موسیٰ کو سینا پر زبانی طور پر عطا کیا گیا جو عہد موسیٰ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہوا چلا آیا اور بعد میں مشنی' (משנה)، توضفتہ (תוספתא)، مِدْرَش (מדרש) اور تَلْمُوْد (תלמוד) وغیرہ کی شکل میں مدون ہو کر آج موجود ہے۔

'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کے بنیادی امور درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ دین موسیٰ کے ذریعہ سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر علمائے یہود یعنی رَب، ربّیم، رَبّن، ربّنان (רב، רבים، רבן، רבנאן) کو عطا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ دین ربیائی (רבני) ہے اور اب علمائے یہود یعنی رَبّنُوت (רבנות) اس کے اصل اور بلاشرکت غیر وارث، محافظ اور ذمہ دار ہیں۔ علمائے یہود ہی وارثِ موسیٰ یعنی وارثِ انبیا ہیں۔

۲۔ یہ رَبّنُوت (רבנות) 'عطا کردہ' ہے۔ یہ رَبّیوں (רבנות) کی مملکت ہے۔ اس مملکت میں رَبّی مختارِ مطلق اور مختارِ کُل ہیں۔

۳۔ 'ربیائی یہودیت' کے ماخذ بنیادی طور پر چار ہیں:

۱۔ مِشْنی' (משנה)

۲۔ تَلْمُود (תלמוד)

۳۔ مِدْرَش (מדרש) مع عبادات کِنِصِتْ اور

۴۔ شِمُونہ عِشِرَہ (שמונה עשרה)۔

۴۔ 'ربیائی یہودیت' کے مطابق تُورَہ یا تُورَات کی کوئی اہمیت نہیں بجز اس کے اسے مکتوب شکل میں اِلُوھِیم، یَہْوَہ اور اَدُوْن نے موسیٰ کو عطا کیا تھا۔ یہ 'تورہ' اب علمائے یہود کے ماتحت ہے۔ چنانچہ مکتوب قانون (Written Law) تابع ہے زبانی قانون (Oral Law) کے۔ چنانچہ ربیوں کے مطابق 'تورہ' (תורה) کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک عبارت اور اس کے ایک ایک حکم کے صرف وہی معنی لئے جائیں گے اور وہی معتبر قرار پائیں گے جو ربی طے کر دیں۔

۵۔ تاریخ یہودیت بتاتی ہے کہ 'ربیائی یہودیت' کے کم از کم چار اقسام کے ائمہ نے چار مرحلوں میں مکتوب قانون (Written Law) یعنی 'تورات' کے معانی تعبیرات اور احکام کو Regulate اور

Formulate کیا۔ یہ چار اقسام کے ائمہ اور ان کے چار مرحلے یا عہد درج ذیل ہیں:

۱۔ سُوفرین (סופרים)

۲۔ تَنّائین (תנאים)

۳۔ اَمُورَائین (אמוראים)

۴۔ سَبورَائین (סבוראים)

سُوفرین (סופרים): علماے 'ربیائی یہودیت' کے مطابق یہ 'علما' ائمہ' اقدم القادمین ہیں۔ یہود میں یہ وہ عالی مرتبت قداسہ ہیں جو عزیر سے شمعون کے عہد تک پائے جاتے تھے۔ علماے یہود کی یہی وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے تَنَكْ (תנך) کو موجودہ 'رسم الخط' میں از سر نو لکھا اور اسے مرتب اور مولّف کیا تھا۔ بالخصوص تَنَكْ کی آیات، ابواب اور ترتیب کو از سر نو مرتب کیا۔ انہوں نے ہی تورات میں 'ضروری' تبدیلیاں کر کے اسے 'ربیائی یہودیت' کے مطابق بنایا بالخصوص اسفارِ خمسہ (תורה) کو هَلَخَّه (הלכה) کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا۔ انھوں نے اصولِ تفسیر 'فِرُوشِی سوفرین' (מדרש סופרים) وضع کئے بطور خاص اس کے اوزانِ کیف وکم۔ شِیْعُورِی سُوفریم (שעורי סופרים) وہ مخصوص تفسیر، تاویل اور تعبیر ہے جن کے ذریعہ تورات کی موجودہ وہ صورت برآمد ہوئی جسے دَبْرِی تورہ (דברי תורה) کہا جاتا ہے۔ یہی وہ موجودہ صورت ہے جسے اب اصل تورات پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ انھیں خدا کی جانب سے قانونی مداوریتا (מדאוריתא) کہا جاتا ہے جنھیں انہی ائمہ کے ذریعہ وضع کردہ علامات سِمُنِیمْ (סימנים) اور رموز رِمْزِیم' (רמזים) سے متعین کیا گیا ہے اور یہی اب توراۃ کی تفسیر 'مَاثُورَہْ' (מסורה) کہلاتے ہیں۔ چنانچہ توراۃ کی عبارات کے اب صرف وہی معانی معتبر اور مقبول ہوں گے جو مَاثُورَہْ ہیں۔ انہی کے ذریعہ توراۃ کو قِرِیْ (קרי) اور کِتِبْ (כתב) سے مقید کر کے اور تقونی سوفریم (תיקוני סופרים) سے مُحرف کر کے نئی شکل میں ڈھالا گیا۔ جس کے لئے مکتوب سوفری منطق دِقْدُوقِ سُوفریم (דקדוק סופרים) اور غیر مکتوب سوفری منطق دقدوقی تورہ (דקדוק תורה) کا سہارا لیا گیا۔ اس پر مستزاد انھیں علماے یہود نے جنھیں سوفریم کہا جاتا ہے حلال وحرام کے نئے احکام خود وضع کئے ان کے وضع کردہ حلال وحرام کے قوانین مثلاً سِینْج (סיג) اور جَدَدْ (גדר) — کہلاتے ہیں جنھیں بعد میں جِزِرَہ (גזרה) کے نام سے موسوم کیا گیا — اور یہی وہ وضع کردہ حلال وحرام کے قوانین ہیں جنھیں 'ربیائی یہودیت' میں دبری سفوریم (דברי סופרים) یا 'اکابر کے سُنَن' کہا جاتا ہے۔

یہ سُنَن توراۃ کے ربانی احکام (עקר האורייתא) کے علی الرغم ہیں لیکن ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ معانی اور تعبیرات ہیں جو اب تورات سے لئے جا سکتے ہیں۔

ثنائین (תנאים): علماے یہود کا دوسرا طبقہ ثنائین سوفرین کے بعد منصۂ شہود پر آیا۔ 'ربیائی یہودیت' کے مطابق یہ ائمہ اقدمین ہیں۔ انھوں نے سوفرین کے کئے ہوئے کاموں کو مزید آگے بڑھایا اور 'فقہ' کے قوانین متعین، جمع اور مرتب کئے۔ ثنائین نے احکام کی تاویل کے اصول مدوت (מדות) بنائے۔ 'قضا' کے اصول وضوابط وضع کئے۔ جِزِیروت ہَتُوبِی دِینِی (גזרות התובי דיני) خواہ عام یعنی ہَلَخُوت قَبُوعُوت (הלכות קבועות) ہوں یا مقامی اور عبوری یعنی ہَلَخُوت مَدِینِی (הלכות מדיני) ہوں وضع کئے۔ یہ مقامی اور عبوری قوانین خواہ مقامی عرف اور عادت سے ماخوذ یعنی مَنْہَج مَدِینِی (מנהג מדיני) ہوں یا ان کے ذریعہ از خود بنا ڈالے گئے ہوں۔۔ وضع کئے۔ انہی علماے یہود کے ذریعہ ہَلَخَۃ کی تاویل، تعبیر اور تعمیل کے لئے مختصر اور رمزیہ فارمولے وضع کئے گئے۔ انھیں بھی ہَلَخَۃ (הלכה) کہا جاتا ہے۔ رمز کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں عام بنی اسرائیلی زبان ارامی (ארמי) سے ہٹ کر ایک مصنوعی اور رمزی زبان میں مرتب کیا گیا جسے لِشُون حَخِیمِ (לשון חכמים) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ 'ربیائی یہودیت' کے علما کو پابند اور ان پر فرض کیا گیا کہ وہ اس رمزی زبان کو تاحیات خفیہ رکھیں اور کسی 'غیر اہل' کو اس کا علم ہرگز ہرگز منتقل نہ کریں۔ چنانچہ اس رمزیہ زبان میں ہَلَخَۃ (הלכה) کو متعین، جمع اور مرتب کیا گیا۔ انھیں لِشُون حَخِیمِ میں شُونَہ ہَلَخَۃ (שונה הלכה)، کلدانی میں تنائی (תנאי) اور فلسطینی ارامی رسریانی میں تَنْوِیَا (תנויא) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان ہَلَخُوت کی تفسیر ثنائین نے کی جنھیں مِدْرَش ہَلَخَۃ (מדרש הלכה) کہا جاتا ہے۔ علماے یہود کے ذریعہ وضع کردہ ہَلَخَۃ اور اللہ کا نازل کردہ (اور اب سوفرین کے ذریعہ از سرنو مرسوم اور مرتب کردہ) توراۃ کے مابین باہم ربط کے اصول مرتب کئے گئے جنھیں مِدْرَش ہَکْتُوبِیم (מדרש הכתובים) کہا جاتا ہے۔ اس سے قبل صمر (סמר) کے اصول مرتب کر کے قَبَلَۃ یعنی مَلَخَہ لِیمِشنیٰ مِسْ سینی (הלכה למשנה מסני) کا اور توراۃ یعنی تورۃ سِبِکْتُبْ (תורה שבכתב) کے مابین ایک حیرتناک بلکہ ساحرانہ ربط قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ 'ربیائی یہودیت' کا پورا نظام اس طرح وضع اور نافذ کر لیا گیا جس کا اللہ کے نازل کردہ 'توراۃ' سے ظاہری ربط تو تھا لیکن در حقیقت ان کا حقیقی کوئی ربط نہ تھا سوائے اس کے کہ ربّیوں کے وضع کردہ سارے قوانین اللہ اور موسیٰ کے

حوالے سے اور ان کے نام پر اب علی الاطلاق نافذ العمل کئے جاتے رہے۔ اب 'ربیائی یہودیت' کے یہی 'قوانین' لِشُون حَخِیمِ میں تَلمُوذ (תלמוד) اور کلدانی میں جمرۂ (גמרא) کہلاتے ہیں۔ بعض علما جو کسی اعتبار سے غیر معمولی تھے انہوں نے اپنی ذاتی سند پر ایک نئے قسم کے ہَلَخَۂ لِیمِشنیٰ مِش سِینِی کو وجود میں لا دیا جنھیں تُوضِفتَه (תוספתא) کے نام سے پکارا گیا۔ مثلاً ربی ایلی عزر (ר' אליעזר) نے ایک توضفتہ مرتب کیا اور دعویٰ کیا کہ انھوں نے انھیں مِشنیٰ اور قبلہ یعنی روایات (Traditions) کو جمع کیا ہے جو کسی نہ کسی امامِ مِشنیٰ کی معمول بہا رہی ہیں۔ مرورِ ایام میں توراۃ کے ربانی قوانین دِین تُورَہ (דין תורה) کو مختلف ائمۂ یہود نے اپنے اپنے مکتبِ فکر کے تحت تبدیل (Modify) کر کے جنھیں تِقنُوت (תקנות) کہا جاتا ہے نہ صرف مدوّن کیا بلکہ انھیں ہَتقِینُو (התקינו) کے اعتبار سے نافذ العمل بھی کر دیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ توراۃ یعنی مِقرا (מקרא) اور ربیائی ہَلَخَۂ کے مابین فیصلہ کن تفریق (Decisive Seperation) قائم ہوگئی۔

ثنائین نے تمام فقہی قوانین اور 'ربیائی یہودیت' کے دیگر سارے ضوابط یکجا کر کے مختلف طریقوں اور ناموں سے مدون کئے۔ انھیں تین اقسام میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ **مشمولات اور شکل کے اعتبار سے مرتب کردہ:** فقہی قوانین (ہَلَخّہ) کی یہ وہ تصنیفات ہیں جنھیں مَسِخْتُ (מסכת) کہا جاتا ہے جو صدریم (סדרים) میں منقسم ہیں۔

۲۔ **توراۃ کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کردہ:** فقہی قوانین (ہَلَخّہ) کی یہ وہ تصنیفات ہیں جن میں توراۃ کی طرح فَرَشِیُوت (פרשיות) پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اقسام مِشنیٰ (משנה) کہلاتے ہیں۔

۳۔ **اِستخراج کے اصول کے مطابق:** توراۃ سے احکام کے مستنبط کرنے کے تیرہ اصول جنھیں 'اقر' کہا جاسکتا ہے وضع کئے گئے۔ ان میں سات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں حِلّیل (הליל) نے اور بقیہ چھ کو ربی اشمعیل (ר' אשמאיל) نے وضع کئے۔ اسی کی بنیاد پر بعد میں ہَلَخُول مرتب کئے گئے۔ انھیں مِقلتہ، مِقلتِین (מכילתא-מכילתין) یا کلدانی میں مِشنیٰ ہَمِدرَش משנה (המדרש) کہا جاتا ہے۔ توراۃ سے ہَلَخّۂ (احکام) کے استخراج کے لئے جن سات اصولوں کو حِلّیل نے وضع کیا وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ صغریٰ سے کبریٰ کا استخراج واستنتاج

۲۔بیانِ کلام سے استقرا
۳۔ایک مخصوص حکم کی تعمیم کر کے
۴۔دو مخصوص احکام کی تعمیم کر کے
۵۔عام اور خاص کے اثر کو اخذ کر کے
۶۔ایک عبارت کا دوسری عبارت سے تفسیر کر کے (تفسیر توراۃ بالتوراۃ)
۷۔سیاقِ کلام سے توضیح کر کے۔

ربی حِلّیل اور ربی اِشمعیل کے تیرہ اصولِ استخراجِ حکم کے علاوہ قابل ذکر ربی عَقِبَہ کا اصول ہے جسے رِبُّوتِی وَ مِیُوت یعنی اصولِ توسیع وتعقید کہا جاتا ہے۔

امورائین (אמוראים): ثنائین کے بعد امورائین (אמוראים) منصۂ شہود پر آئے۔ 'ربیائی یہودیت' کے مطابق یہ ائمہ متقدمین ہیں۔ انھوں نے ثنائین کی تصنیفات اور ان کی عبارتوں کی توضیح، تشریح اور تفسیر کی لہذا انھیں مترجمان (מתורגמן) بھی کہا جاتا ہے۔ امورائین نے مشنیٰ کی مطوّل تشریح، توضیح اور تفسیر کی۔ امورائین کی یہ تالیفات مِشنِیُوت (משניות) کلدانی میں مِشنِی تِین اور مِتنِی تِن/ مشنتنو (מתניתין/ מתניתן/ משנתנו) کہلاتی ہیں۔ ان میں ربی اَشایہ نے جنھیں اَبُو المشنیٰ بھی کہا جاتا ہے خارجی مشنیٰ (משנה חיצונה) جسے کلدانی میں مِتنیتاً وَرَائِتاً (מתניתה בריתא) بھی کہا جاتا ہے مرتب کی۔ ربی اشایہ اور ربی حیی نے ربی نِہیمیہ کے اصول پر ایک اور قسم کی کتاب مرتب کی جسے توضفتہ کہا جاتا ہے۔

سبورائین (סבוראים): امورائین کے بعد سبورائین (סבוראים) منصۂ شہود پر آئے۔ انھوں نے رائ یعنی سَبَرْ (סבר) کی بنیاد پر احکام کی تشریح وتوضیح کی۔ چنانچہ انھیں سبورائین کہا جاتا ہے۔ تلمود کی آخری تالیف وتوضیح کرنے والے اور 'ربیائی یہودیت' کی تکمیل کرنے والے یہی سبورائین ہیں۔

انھیں حَخَمِیْ هَتَلْمود (חכמי התלמוד) بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے چند ایسی تالیفات بھی کیں جنھیں رسائل صغریٰ قطنوت مَصَفُوت (קטנות מסכות) کہا جاتا ہے۔

۶۔اس طرح 'ربیائی یہودیت' کے بنیادی ماخذ میں ہر چند کہ برائے نام تورہ (תורה) اب بھی شامل ہے لیکن 'تورہ' سے مراد وہ هَلَخَہْ ہیں جو حِلّیل، اِشمعیل یا دیگر ائمہ کی تفسیروں میں اور ان

کے ذریعہ استخراج کیۓ ہوۓ احکام میں ہیں یا وہ معانی جو ان سے قبل سوفرین نے 'ماثورہ' یا 'مشورہ' کے اعتبار سے متعین کردیۓ تھے۔ اس طرح 'ربیائی یہودیت' کے تمام ماخذ درج ذیل ہوۓ:

۱۔ مِشنیٰ (משנה)

۲۔ تُوضِفتَہ (תוספתא)

۳۔ تَلمُود بابُلی (תלמוד בבלי)

۴۔ تَلمُود یَروشَلامیٔ (תלמוד ירושלמי)

۵۔ مِدرَشیم (מדרשים)

مِدرَش کے دو اقسام ہیں:

۱۔ ہَلَخِی (הלכי) یعنی احکامی

۲۔ ہَگادِی (הגדי) یعنی روایاتی، تاریخی وغیرہ

'ربیائی یہودیت' میں فوقیت اور بنیادی اہمیت صرف اور صرف ہَلَخِی (הלכי) یعنی احکامی مِدرَش کی ہے۔

ان مِدرَشوں میں تین بہت مشہور اور بنیادی ہیں:

۱۔ مِدرَش رَبّہ (מדרש רבה)

۲۔ پِیسِقتَہ دَرَبْ کَاھَنَہ (פסיקתא דרב כהנא) اور

۳۔ پِسِقتَہ رَبِّتِی (פסיקתא רבתי)

ان کے علاوہ مِخِلتَہ، تنھومہ اور یَلقُوت بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ارامی تفاسیر اور ان کی توضیحات بھی اہمیت کی حامل ہیں جنھیں 'تَرجُم' (תרגם) کہا جاتا ہے۔

۷۔ علماۓ یہود کا اس امر پر 'اجماع' ہے کہ اب جب کہ یہ مکتوب اور زبانی قوانین انھیں عطا کر دیۓ گۓ ہیں تو جب تک یہ دنیا قائم ہے اس 'دین' اور اس میں داخل ہر چیز کی وہی تاویل، وہی تعبیر اور وہی معانی معتبر ہوں گے جنھیں 'علماۓ یہود' بیان کردیں۔ اس میں کسی کو ذرہ برابر بھی مداخلت کا اختیار نہیں۔ نہ انبیا کو، نہ رسولوں کو نہ حضرتِ موسیٰ کو اور نہ ہی خداۓ ذوالجلال کو۔ اور اگر ان میں سے کوئی بھی مداخلت کرے تو وہ علی الاطلاق، بلا استثنا اور بلا غور وخوض قابلِ رد ہی نہیں بلکہ قابلِ تعزیر بھی ہے۔ اس کی واضح طور پر تشریح کرتے ہوۓ تلمود بابلی (תלמוד בבלי) میں ایک روایت بَاوَا مِیصِیۃ ب

/59 میں درج ہے۔ اس پوری عبارت کا یہاں درج کرنا تقریبِ فہم کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے:

''کہا جاتا ہے کہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ذرا قبل) ربی ایلی عزر اور دیگر علمائے یہود کے مابین 'پختہ تنور' کے پاک ہونے پر اختلاف واقع ہو گیا۔ ربی ایلی عزر نے (توراۃ اور دیگر ماخذ سے) دلائل دیئے لیکن علمائے یہود ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے (اور ان کا اختلاف برقرار رہا)۔ ربی ایلی عزر نے (نقلی اور عقلی) دلائل سے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا اختلاف پھر بھی برقرار رہا۔ چنانچہ ربی ایلی عزر نے کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل توراۃ کے عین مطابق ہیں تو یہ خرنوب (Carob-Tree) اس کی گواہی دے دے۔ ربی ایلی عزر نے جیسے ہی یہ کہا وہ خرنوب (Carob-Tree) اپنی جڑ سے اکھڑ کر 100 ہاتھ دور چلا گیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر اختلاف کرنے والے علما نے کہا: خرنوب سے کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ تب ربی ایلی عزر نے پھر کوشش کی اور کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل توراۃ کے عین مطابق ہوں تو یہ ندی الٹے سمت رواں ہو کر میرے موقف کے درست ہونے کو ثابت کر دے۔ ابھی ایلی عزر کی دعا ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ندی الٹے سمت بہنے لگی۔ اس واقعہ سے بے پروا اختلاف کرنے والے علما نے کہا: پانی کی ندی سے ثبوت نہیں لائے جا سکتے۔ ربی ایلی عزر تیسری بار سامنے آئے اور کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل عین توراۃ کے مطابق ہیں تو اس مدرسہ کی دیواریں ڈھ جائیں۔ اس سے قبل کہ ربی ایلی عزر کی دعا ختم ہوتی مدرسہ ڈھنے لگا۔ اس وقت ربی یُوشُوَا نے مدرسے کی دیواروں کو مخاطب کر کے کہا: جب علما 'فقہ' پر بحث کر رہے ہوں تو تمہاری مداخلت کا کیا جواز؟

اس صورتحال پر ربی ایلی عزد نے جھلا کر کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل توراۃ کے عین مطابق ہیں تو خدا خود اس کی گواہی دے۔ ربی ایلی عزد کی اس دعا پر آسمان سے آواز آئی: اے علمائے یہود تم ربی ایلی عزد سے کیوں جھگڑتے ہو جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ اللہ کی کتاب ہر اعتبار سے اس سے متفق ہے۔

اس پر ربی یُوشُووا نے کہا: הא:לא בשמים (הדברים:30:12) 'یہ عرش نہیں (ہے)'۔

ربی یُوشُووا (کے قول) کی تشریح کرتے ہوئے رَبِّی یَرْمِیَاہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ایک بار موسیٰ کو توراۃ طور سینا پر دے دی تو پھر اب اللہ تعالیٰ کو ان فقہی معاملات میں مداخلت کا کیا اختیار؟ موسیٰ نے وہ توراۃ ہم ربیوں کو دے دی۔ اب ہم کلی اختیار رکھتے ہیں کہ جیسے چاہیں اس کی تشریح و تعبیر کریں۔ اور اب ہم ربی 'اجماع' سے اس کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ربی ایلی عزد کو کافر اور مرتد قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حکم اور صلاۃ

ا۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا برپا کردہ 'نظامِ اسلام' 661 عیسوی میں ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) اسلام مذہب (؟) کا لبادہ زیب تن کر کے برپا ہوگئی۔ چونکہ یہ مذہب اسلام ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی عربی ماحول میں تشکیل جدید تھا اس لئے اس میں کلدانی، ارامی اور عبرانی کی جگہ بدوی عربی توجیہ (Orientation) اور تعمیم (Vulgarization) کا عنصر غالب رکھا گیا لیکن صرف اس حد تک کہ دیواروں کی باہری پرت بدوی عربی تھی جب کہ اندر کی ساری عمارت ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی تھی جو ارامی، کلدانی اور عبرانی اینٹوں، پتھروں اور مسالوں سے بنی ہوئی تھی۔ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی یہ عربی شکل اصل ربیائی یہودیت کی طرح ہی خدا مخالف: توحید مخالف (Anti-Allah)، رسول مخالف: رسالت مخالف (Anti-Rasulullah) اور قرآن مخالف: ھدی مخالف (Anti-Divine Guidance) تھی۔ یہ بھی انھیں تین ستونوں پر قائم مذہب تھا:

ا۔ خود کفیل عبادت

۲۔ خود کفیل اطاعت

۳۔ خود کفیل ھدایت

۲۔ یہ چونکہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) ہی تھا اس لئے اس مذہب اسلام کے بھی دو منابع تشکیل دیئے گئے:

ا۔مکتوب قانون(Written Law):

۲۔زبانی قانون(Oral Law):

661عیسوی کے بعد متمکن اسلام میں مکتوب قانون (Written Law) سے مراد 'قرآن' تھا جب کہ زبانی قانون (Oral Law) سے مراد 'سنت' تھی۔سنت کی دوسری معروف تعبیرات 'خبر'، 'اثر' اور 'روایت' بھی ہیں۔لیکن 'سنت' کی سب سے معروف تعبیر 'حدیث' کے نام سے موسوم ہوئی۔محدثین عام طور پر 'حدیث' مراد لیتے ہیں جب کہ فقہا اور بالخصوص اصولیین 'سنت'۔

۳۔اسلام کی ابتدائی اور بنیادی شکل وصورت متعین کرنے والوں نے قران کو ربیائی یہودیت سے بھی نچلی سطح یا کم ازکم کمتر درجے پر رکھا۔ربیائی یہودیت نے توراۃ (Torah) یعنی مکتوب قانون کو لُوخُوت (לוחות) مانا جب کہ علمانے قران کو 'حدیث' قرار دے دیا۔علماے اسلام نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب کو 'القرآن' اور مُنَزّل مِنَ اللہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے 'حدیث' قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک قرآن دراصل 'حدیث متواتر' کا نام ہے۔

۴۔ 661عیسوی کے بعد اس اسلام کی جسے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان کو بتمام وکمال پہنچادیا تھا پوری ترتیب پلٹ دی گئی۔آنخصور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک 'اسلام' اللہ کا دین تھا جسے انھوں نے بنی نوع انسان کو مکمل طور پر پہنچادیا۔اوران کے اصحاب نے اس کی گواہی دی۔

[ملاحظہ فرمائیں:القاضی ابوبکر الباقلانی:اعجاز القران:خطبہ حجۃ الوداع]

موجودہ 'اسلام' وہ دین ہے جسے 'علما' نے تسلیم اور قبول کیا۔جو علما کا تسلیم اور قبول کردہ نہیں وہ 'اسلام' نہیں ہے۔

۵۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ا۔ قل اطیعوا اللہ و الرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکٰفرین(آل عمران ۳۲)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے: حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے)

۲۔وما ارسلنا من رسول إلا لیطاع باذن اللہ ولو انہم اذظلموا انفسہم جاءُوك

فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لو جدوا الله توابا رحيما. فلا ور بك لا يؤمنون حتی یحکموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليما. (النساء ۶۴۔۶۵)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے۔ اور اگر وہ لوگ جس وقت انھوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔ سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ ہی کو منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

۳۔ یا یھا الذین آمنوا اطیعوا الله و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوه الی الله والرسول ان کنتم تؤمنون بالله والیوم الآخر ذلك خیر و احسن تاویلا۔ (النساء ۵۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام۔

۴۔ ففروا الی الله انی لکم منه نذیر مبین (الذریٰت ۵۰)

ترجمہ: سو بھاگو اللہ کی طرف میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر۔

اس پوری تدریج (Graduation & Hierarchy) کو از حد مکر سے پلٹ دیا گیا۔ موجودہ صورت حال کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی بات کی تصدیق —— رد اور قبول —— محدثین کرتے ہیں —— محدثین کی تصدیق —— ردو قبول محدثین جرح و تعدیل کرتے ہیں —— محدثین جرح و تعدیل کی تصدیق —— ردو قبول —— فقہا کرتے ہیں —— اور فقہا کی تصدیق —— ردو قبول —— علما کرتے ہیں۔ گویا اللہ اور رسول پر اب 'علما' حاکم اور فیصل بنا دیئے گئے ہیں۔

۲۔ دقت نظر سے غور کیا جائے تو: نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین مکمل طور پر پہنچایا تھا اس کی دو خصوصیات تھیں:

۱۔ قاعدہ (Bedrock / Bottomline): نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچائے

ہوئے دین کا قاعدہ (Bedrock & Bottomline) خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی جو قیامت تک قائم رہنے والی ہے۔ آپ تا قیامت نبی، رسول، ھادی، داعی الی اللہ، نذیر، سراج منیر اور حَکَم ہیں۔

۲۔ صُعُود (Ascending Order): نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچائے ہوئے دینِ اسلام کا مزاج صُعُود کی طرف متوجہ اور متجہ ہے۔ یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قاعدہ اور بنیاد ہیں اور اسلام اور اس کے متبعین کا رخ اوپر یعنی اللہ کی جانب ہے۔ ہدایت کے لئے بھی اور تصدیق کے لئے بھی۔ یہی صورتحال عہدِ نبوی میں تھی۔ یہی اس اصلی دین اسلام کی خصوصیات تھیں جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

۷۔ 661 عیسوی کے بعد جا گیر اسلام میں صورت حال بالکل پلٹ گئی:

۱۔ قاعدہ (Bedrock & Bottomline): موجودہ اسلام میں قاعدہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہ گئے بلکہ سب سے نچلی سطح کے 'علمائے اسلام' قرار پائے۔

۲۔ ہُبُوط (Descending Order): موجودہ اسلام اور اس کے مزاج کی ہر چیز مائل بہ ہبوط بنادی گئی ہے۔ اللہ کی تصدیق رسول کے نام سے کی جاتی ہے اور یہ تصدیق محدثین کرتے ہیں۔ محدثین کی تصدیق محدثین جرح وتعدیل کرتے ہیں۔ محدثین جرح وتعدیل کی تصدیق فقہا کرتے ہیں اور فقہا کی تصدیق علما کرتے ہیں۔

چنانچہ 661 عیسوی کے بعد رائج اسلام کا رخ حقیقۃً اور عملاً، ہُبُوطی (Descending)، اضمحلالی (Degenerating) اور تحلیلی (Diluting) بن گیا ہے۔ یہاں دین کا سفر خالص (Pure) سے آلودہ (Impure) کی جانب ہوتا ہے؛ معیاری (Standardized) سے غیر معیاری (Unstandardized) کی جانب ہوتا ہے؛ محرم (Sanctioned) سے غیر محرم (Non Sanctioned) کی جانب ہوتا ہے؛ اصلی (Original) سے نقلی (Spurious) کی جانب ہوتا ہے؛ اور مجاز (Licensed) سے غیر مجاز (Unlicensed) کی جانب ہوتا ہے۔

۸۔ علوم اسلامی میں سب سے عمیق، وسیع اور عریض علم اصولیین کا ہے جو علوم حدیث اور علوم فقہ دونوں کو جامع اور محیط ہے اور ان اصولیین میں اصولیینِ احناف کا ہے لہذا 661 عیسوی کے بعد واقع ہونے والی تبدیلی کو مزید واضح اور منقح کرنے کے لئے فقہ حنفی کی مثال دی جاتی ہے چونکہ اس کی تفصیل اور

تحلیل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں تاہم ذیل میں دیا گیا مختصر ترین خاکہ اس Upside Down تبدیلی کو ان شاء اللہ پوری طرح واضح کر دے گا۔

۱۔ اصول فقہ کے مطابق 'اَدِلّۃ شَرعِیّہ' چار قرار پائے:

۱۔ قرآن

۲۔ سنت

۳۔ اجماع اور

۴۔ قیاس

دقت نظر سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ اسلام میں 'قرآن' تابع ہے 'سنت' (حدیث) کے، 'سنت' (حدیث) تابع ہے 'اجماع' کے اور 'اجماع' تابع ہے 'قیاس' کے اور 'قیاس' کسی فرد (علما) کی رائے کو کہتے ہیں۔

۲۔ 'علما' کے نزدیک 'قرآن' اور 'سنت' 'حدیث' ہیں۔ چنانچہ 'حدیث' کے تین اقسام قرار پائے:

۱۔ حدیث باعتبارِ حقیقت

۲۔ حدیث باعتبارِ سند اور

۳۔ حدیث باعتبارِ مصدر سنت

۳۔ سنت باعتبارِ حقیقت کی 'علما' نے دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ سنت قولیہ اور

۲۔ سنت فعلیہ

۴۔ حدیث باعتبارِ مصدر سنت کی 'علما' نے دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ سنت نبویہ اور

۲۔ سنت صحابہ

۵۔ 'علما' کے نزدیک 'حدیث' (یعنی قرآن و سنت) در اصل 'اجماع' ہیں۔ چنانچہ حدیث باعتبار سند کی دو اقسام قرار پائیں:

۱۔ مسند اور ۲۔ مرسل

۶۔ احادیث مسند کی تین قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔متواتر

۲۔مشہور اور

۳۔خبرِ واحد

(اصولِ حدیث کے مطابق (۱) الخبر المتواتر اور (۲) خبر الآحاد۔مشہور، عزیز اور غریب)

۷۔احادیث مرسل کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔مرسل صحابی ۲۔مرسل تابعی ۳۔مرسل تبع تابعی اور ۴۔مرسل غیر

۸۔'علما' کے مطابق اجماع بھی قیاس ہے مگر اتفاقی یعنی 'علما کی آرا کے اتفاق' کو اجماع کہتے ہیں۔ چنانچہ اس اجماع کے تین اقسام قرار دیئے گئے:

۱۔اجماع باعتبارِ صورت اتفاق

۲۔اجماع باعتبارِ اہل اجماع وحال اجماع

۳۔اجماع باعتبارِ نقل ومراتب۔

۹۔۱۔اجماع باعتبار صورت اتفاق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔صریح اور

۲۔سکوتی

۲۔اجماع صریح کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔صریح فعلی اور

۲۔صریح قولی

۳۔اسی طرح 'اجماع سکوتی' کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔اجماع سکوتی قولی اور

۲۔اجماع سکوتی فعلی

۴۔اجماع باعتبار اہل اجماع وحال اجماع کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔اجماع صحابہ اور

۲۔اجماع ماسوائے صحابہ

۵۔اجماع صحابہ کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔صریح اور

۲۔سکوتی

۶۔اجماع ماسوائے صحابہ کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔اجماع بدون اختلاف سابق اور

۲۔اجماع بعد از اختلاف سابق

۷۔اجماع باعتبار نقل و مراتب کی تین قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔اجماع متواتر

۲۔اجماع مشہور اور

۳۔اجماع احادی

۱۰۔'علما' نے علما کے ذریعہ 'رائ' کے اظہار اور اسے اختیار کرنے کو 'اجتھاد' قرار دیا ہے۔ چنانچہ:

۱۔اجتھاد کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔اجتھادِ عقلی اور

۲۔اجتھادِ بیانی

۲۔اجتھادِ عقلی کی کم از کم چار قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔قیاس

۲۔استصلاح

۳۔استحصان اور

۴۔استصحاب

۳۔علما نے 'قیاس' کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔قیاسِ جلی اور

۲۔قیاسِ خفی

۴۔علما نے استصلاح کو 'مصلحت' سے مشروط کیا ہے جس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ضرورات

۲۔حاجات اور

۳۔ تحسینات

۵۔ علما نے استحصان کی چار قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ استحصان بالعقل

۲۔ استحصان بالاثر

۳۔ استحصان بالتعامل اور

۴۔ استحصان بالضرورۃ۔

۶۔ اسی طرح 'علما' نے استصحاب کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ استصحاب عدم اصلی اور

۲۔ استصحاب حکم شرعی۔

۱۱۔ اصولیین نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مراد' کی نعوذ باللہ تحدید اور تعیین کرنے کا منصب جلیلہ 'علما' کو عطا فرما دیا ہے۔ چنانچہ 'علما' کے ذریعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مراد' کی تحدید و تعین کو 'اجتھاد بیانی' کہا جاتا ہے۔

۱۲۔ 'علما' نے دائرۂ عمل کے اعتبار سے 'علما کی رائ' (اجتھاد) کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ اجتھادِ مطلق اور

۲۔ اجتھادِ مقید

'اجتھادِ مطلق' کو 'اجتھادِ مستقل' اور 'اجتھاد فی الشرع' بھی کہتے ہیں۔

'اجتھادِ مقید' کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ مذہب میں اجتھاد

۲۔ مسائل میں اجتھاد

۳۔ تخریج میں اجتھاد اور

۴۔ ترجیح میں اجتھاد

۱۳۔ 661 عیسوی کے بعد رائج کردہ اسلام میں 'علما' نے اپنے علاوہ امتِ مسلمہ کے ہر فرد کو 'تقلیدِ محض' کا پابند کیا ہے۔ 'تقلیدِ محض' کا مفہوم ہے ''کسی مجتہد سے منقول مسائل کی بابت تحقیق کے بغیر (؟) ان کو نقل کرنا اور ان پر عمل کرنا''۔

۱۴۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس اسلام میں 'فرد' سے مراد دو قسموں کے افراد ہیں:

۱۔ عام 'علما' اور

۲۔ بقیہ امتِ مسلمہ

چنانچہ 'علما' کے مطابق یہاں بھی 'تقلیدِ محض' کی دو صورتیں جاری ہوئیں:

۱۔ عام علما: عام علما کی 'تقلیدِ محض' سے مراد ہے عام علما کو براہ راست کتابوں سے مذہب کے اقوال کا علم ہوتا ہے۔

۲۔ بقیہ امتِ مسلمہ: بقیہ امتِ مسلمہ کی 'تقلیدِ محض' سے مراد ہے 'علما' سے سن کر بلا تحقیق ان کو نقل کرنا اور ان پر عمل کرنا۔

۹۔ 661 عیسوی کے بعد اسلام مکمل طور پر ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) بنا دیا گیا۔ جس طرح ربیائی یہودیت میں سوفرین کی تحدید کے بعد توراۃ کے متن کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ اب اس کے وہی معنی معتبر اور مقبول بلکہ قابل قبول تھے جو 'ماثورہ' کے عین مطابق ہوں۔ یہی بات 'تفسیر بالماثور' کے نام سے اسلام میں مکمل طور پر درآمد کر لی گئی۔ متنِ قرآن کی اسلام میں اب کوئی اہمیت باقی نہیں بچی تھی۔ اب اس کے وہی معنی معتبر اور قابل قبول تھے جو تفسیر بالماثور کے عین مطابق ہوں۔ جس طرح ربیائی یہودیت میں توراۃ کے دو حصے قرار دیئے گئے: اول: ہَلَخَّاہ (הלכה) اور دوم: ھگّادَہْ (הגדה)۔ چنانچہ ربیائی یہودیت نے ھلخاہ کو راجح اور ھگادہ کو مرجوح قرار دیا۔ 661 کے بعد اسلام میں بھی قرآن کی یہی صورت قرار دی گئی۔ قرآن کو 'حدیث متواتر' قرار دے کر راجح اور بقیہ قرآن یعنی مشہور، شاذ اور آحاد کو حدیث مشہور، شاذ اور آحاد قرار دے کر مرجوح قرار دے دیا گیا۔ اس پر مستزاد 'قرآن' کو 'حدیثِ متواتر' قرار دیا گیا لیکن اسے ماورائے قرآن 'احادیث' کے تابع قرار دے دیا گیا۔

۱۰۔ اس 'ظلم' کے لئے ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) سے ایک اصطلاح بطور خاص درآمد کی گئی۔ یہ اصطلاح تھی 'نسخ' (נסח)۔ اسلام میں نسخ کے معنی بیان کئے گئے:

'سابق حکم شرعی کو بعد کی کسی شرعی دلیل کے ذریعہ ختم کر دینا'۔ اس کی حکمت بیان کی گئی کہ زمانہ کے ساتھ بندوں کے مصالح اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور تمام احکام شرع کی بنیاد بندوں کے مصالح پر ہے۔ اس کی ایک ایسی اصولی تعریف کی گئی جس سے اس کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

"النسخ فی اصطلاح الأصولیین هو ابطال العمل بالحکم الشرعی بدلیل متراخ

عنه. يدل على ابطاله صراحة أو ضمناً، ابطالاً كلياً او ابطالاً جزئياً لمصلحة اقتضته أو هو إظهار دليل لاحق نسخ ضمناً العمل بدليل سابق "۔

[ملاحظہ فرمائیں: عبدالوھاب خلاف: علم اصول الفقہ: دارالقلم: کویت]

اسی طرح اس کی حکمت کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"وهذا النسخ وقع في التشريع الالهي، ويقع في كل تشريع وضعي، لأن المقصود من كل تشريع سواء أكان إلهياً أم وضعياً تحقيق مصالح الناس. ومصالح الناس قد تتغير بتغير احوالهم. والحكم قد يشرع لتحقيق مصالح اقتضتها أسباب، فاذا زالت الأسباب فلا مصلحة في بقاء الحكم" [ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق]

چنانچہ نسخ کی صورتوں کو 'علما' نے چار قرار دیا:

۱۔ قرآن مجید کا نسخ قرآن سے: واضح رہے کہ موجودہ 'قرآن' قرآن مُنَزَّل مِنَ اللہ نہیں بلکہ 'علما' کے نزدیک 'حدیث متواتر' ہے۔

۲۔ قرآن (حدیثِ متواتر) کا نسخ حدیث سے،

۳۔ حدیث کا نسخ قرآن (حدیثِ متواتر) سے ــــ اور

۴۔ حدیث کا نسخ حدیث سے۔

اس اعتبار سے آیات اور احکام کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ ناسخ اور

۲۔ منسوخ

منسوخ آیات اور حکم کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوں

۲۔ حکم منسوخ ہو تلاوت منسوخ نہ ہو

۳۔ تلاوت منسوخ ہو حکم منسوخ نہ ہو۔۔ اور

۴۔ حکم کا کوئی وصف منسوخ ہو۔

لطف یہ ہے کہ خود قرآن کی آیاتِ منسوخہ کی کوئی متعین، مستند اور معلوم تعداد نہیں۔ چنانچہ 'بعض علما' نے مثلاً قاضی ابن عربی المالکی اور جلال الدین السیوطی نے بیس سے زیادہ آیات کو منسوخ قرار دیا ہے

جب کہ مثلاً شاہ ولی اللہ نے صرف پانچ آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔

[ملاحظہ فرمائیں:

۱۔فخر الدین رازی: مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)

۲۔ابن العربی: احکام القرآن

۳۔شاہ ولی اللہ: الفوز الکبیر فی اصول التفسیر]

چنانچہ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو قرآن جیسے 'جسدِ متعین' (Fixed Corpus) کو پوری طرح حدیث جیسے جسد غیر متعین (Non-Fixed Corpus) کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور اس حدیث (Non-Corpus) کو رد اور قبول اور تعبیر و تاویل کے اعتبار سے 'علما' کے ماتحت کر دیا گیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں مآخذ یعنی قرآن (علما کے نزدیک حدیث متواتر، مشہور، شاذ اور آحاد) اور حدیث (علما کے نزدیک متواتر، مشہور اور خبرِ واحد) کے حکمِ تکلیفی اور حکمِ وضعی کی ہر صورت 'علما' کے فہم پر مبنی کر دی گئی۔

۱۔ چنانچہ حکم تکلیفی کی دو قسمیں کی گئیں:

۱۔حکم تکلیفی باعتبارِ دلائل ثبوت و قیودِ تعریف اور

۲۔حکمِ تکلیفی باعتبار احوال و اعذار

حکمِ تکلیفی باعتبار دلائلِ ثبوت و قیودِ تعریف کی دو صورتیں تسلیم کی گئیں:

۱۔جائز اور

۲۔جائز از بعض وجوہ و ناجائز از بعض وجوہ

چنانچہ جائز کی 'علما' نے پانچ قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔فرض

۲۔واجب

۳۔سنت

۴۔مستحب اور

۵۔مباح

اسی طرح جائز از بعض وجوہ اور ناجائز از بعض وجوہ کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔مکروہ تحریمی

۲۔مکروہ تنزیہی

۳۔خلاف اَولی اور

۴۔حرام

۲۔حکم وضعی کو علما نے پانچ امور سے مقید و محدود کیا ہے:

۱۔علت

۲۔شرط

۳۔سبب

۴۔علامت

۵۔مانع

عِلّت کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔عِلّتِ منصوصہ اور

۲۔عِلّتِ مستنبطہ

شرط کے تین اقسام کئے گئے ہیں:

۱۔شرط باعتبارِ ذات

۲۔شرط باعتبارِ متعلق

۳۔شرط باعتبارِ اوصاف

سبب کے دو اقسام کئے گئے ہیں:

۱۔سبب باعتبارِ ذات اور

۲۔سبب باعتبارِ متعلقات و اوصاف

مانع کی دو قسمیں کی گئی ہیں:

۱۔مانع از حکمِ تکلیفی اور

۲۔مانع از حکمِ وضعی

چنانچہ قرآن اور حدیث میں جتنے الفاظ ہیں ان میں ایک ایک لفظ کے صرف وہی معنی معتبر اور قابل

قبول ہوں گے جو 'علما' کی رائے ہوگی۔ چنانچہ لفظ کے معنی کے اعتبار سے 'علما' نے اس کی پانچ قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔لفظ باعتبارِ خفاء معنی
۲۔لفظ باعتبارِ ظہورِ معنی
۳۔لفظ باعتبارِ تعدد و توحدِ معنی
۴۔لفظ باعتبارِ استعمال در معنی اور
۵۔لفظ باعتبارِ استدلال از معنی۔

چنانچہ الفاظ باعتبارِ خفاء معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔خَفی
۲۔مُشْکِل
۳۔مُجْمَل اور
۴۔مُتَشَابہ۔

الفاظ باعتبارِ ظہورِ معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ظاہر
۲۔نص
۳۔مفسّر ــــ اور
۴۔محکم

الفاظ باعتبارِ تعدد و توحدِ معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔خاص
۲۔عام
۳۔مشترک
۴۔موؤل

الفاظ باعتبار استعمال در معنی کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔حقیقت اور

۲۔مجاز

اور الفاظ باعتبارِ استدلال از معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔عِبَارَۃُ النص

۲۔إشَارَۃُ النَّص

۳۔دَلَالَۃُ النَّص اور

۴۔مُقتضی النَّص

الفاظ باعتبارِ تعدد وتوحد معنی کے تحت بیان کردہ 'خاص' کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔خاص باعتبارِ معنی اور

۲۔خاص باعتبارِ تقیید

خاص باعتبار معنی کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔امر اور

۲۔نہی

خاص باعتبارِ تقیید کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔مُطلَق اور

۲۔مُقیَد

خاص باعتبارِ معنی کی دو قسموں میں 'امر' کی پانچ قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔امر باعتبارِ حُسن

۲۔امر باعتبارِ تعلقِ وقت

۳۔امر باعتبارِ تعینِ مامور بہ

۴۔امر باعتبارِ تحدید مقدار

۵۔امر باعتبارِ ذات

نہی کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ قبیح لِعَینِہٖ اور

۲۔قبیح لِغَیرِہٖ

۱۱۔اس طولِ بحث کا مقصد عاجز کے نزدیک صرف یہ واضح کرنا ہے کہ 661 عیسوی کے بعد رائج کردہ اسلام کے ایک ایک لفظ کے صرف وہی معنی معتبر اور قابلِ قبول ہیں جو 'علما' نے متعین کئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کسی حکم کا اللہ اور اللہ کے رسول کے مفہوم سے مطابقت ظاہر کی جاتی ہے تو محض اس لئے اور صرف اس حد تک کہ انھیں 'علما' نے معتبر اور قابلِ قبول قرار دیا ہے۔ ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ نسخ، حدیث، اجماع، اجتہادِ عقلی، اجتہادِ بیانی، عرف اور عادت جیسے 'ادوات' (Instruments) سے اللہ اور رسول کی ہر مراد کو رد کیا جا سکتا ہے۔ 900 عیسوی آتے آتے ان 'علما' نے جو دراصل اسلام کو 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) میں ڈھالنے کے ذمہ دار تھے انہوں نے کسی تبدیلی کا سلسلہ ہی ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیا۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ 'اجتہادِ مطلق' کا دروازہ عملاً بند کر دیا گیا ہے اور اسلام میں 'علما' اسی مقام بلند پر فائز کر دیئے گئے جہاں ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) میں اللہ اور حضرت موسیٰ کو بے دخل کر کے 'علماے یہود' فائز کر دیئے گئے تھے جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا تھا:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ والمسیح بن مریم (التوبہ ۳۱)

ترجمہ: ٹھہرالیا (یہودیوں نے) اپنے 'علما' کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور (ٹھہرالیا نصاریٰ نے) اپنے درویشوں کو (خدا اللہ کو چھوڑ کر) اور مسیح ابن مریم کو۔

[ملاحظہ فرمائیں:]

۱۔ محمد بن الحسن الشیبانی : کتاب الأصل : دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد

۲۔ قاضی ابویوسف : کتاب الخراج : بولاق، مصر

۳۔ محمد بن ادریس الشافعی : کتاب الأم : دار المعرفۃ، بیروت

۴۔ محمد بن ادریس الشافعی : الرسالۃ : المکتبۃ العلمیۃ، بیروت

۵۔ احمد بن محمد البرقی : المحاسن : المجمع العلمی لاھل البیت، بیروت

۶۔ محمد بن یعقوب الکلینی : الأصول من الکافی : دار الأضواء، بیروت

۷۔ فیض الکاشانی : کتاب الوافی : مکتبۃ الامام، اصفہان

۸۔ شیخ صدوق : کتاب من لا یحضرہ الفقیہ : دار التعارف، بیروت

۹۔ محمد بن الحسن الشیبانی : الجامع الصغیر :

۱۰۔ محمد بن الحسن الشیبانی : السیر الکبیر :

۱۱۔ محمد بن الحسن الشیبانی : الجامع الکبیر :

۱۲۔ محمد بن الحسن الشیبانی : کتاب الآثار : ادارۃ القران والعلوم الاسلامیہ، کراچی

۱۳۔ القاضی النعمان بن محمد : کتاب اختلاف اصول المذاهب : المعهد الهندی للدراسة المتقدمة:1972

۱۴۔ القاضی النعمان بن محمد : دعائم الإسلام : قاہرہ

۱۳۔ محمد بن عبداللہ الحاکم نیسابوری : معرفة علوم الحديث : دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد

۱۴۔ ابوبکر احمد خطیب البغدادی : الكفاية فی علم الرواية : دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد

۱۵۔ ابن حجر العسقلانی : نخبة الفكر فی مصطلح اهل الأثر :

۱۶۔ ابن نقطہ : كتاب التقييد لمعرفة الرواة و السنن والمسانيد: : دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد

۱۷۔ عبدالوہاب خلاف : علم أصول الفقه : دار القلم، کویت

۱۸۔ اسرار عالم : امت کا بحران : دار العلم، نئی دہلی ۲۰۰۶

ذہنی بحران

۱۔ گزشتہ چودہ سو سالوں کی مسلم تاریخ کا جائزہ 'علما' کے تعامل کے پیٹرن (Pattern) کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ علما کے تعامل کے اس مخصوص پیٹرن (Pattern) اور اس کی حرکیت (Dynamics) کا ہی نتیجہ ہے کہ امتِ مسلمہ صد فی صد مکیف (Conditioned) ہو کر ذہنی اور عملی اعتبار سے بالکل مفلوج ہوگئی۔ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلم معاشرے کا رشتہ منقطع کر دیا گیا۔ قرآن امتِ مسلمہ کے درمیان اجنبی بنا دیا گیا۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنت' امتِ مسلمہ کے درمیان نہ صرف عملاً مٹا دی گئی بلکہ اس کے نقوش تک باقی نہیں رہے۔ قرآن کا سیکھنا، سکھانا، قرآنی زندگی کا عملی نمونہ بننا حرام، ممنوع اور شنیع قرار دے دیا گیا۔ قرآن کی اور قرآن میں تحقیق گمراہی قرار دے دی گئیں۔ چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ امتِ مسلمہ ذہنی، فکری، علمی، عملی، تجرباتی، اخلاقی غرض ہر اعتبار سے معطل اور مفلوج ہو کر رہ گئی۔

مسلم تاریخ کے ہر صفحے پر موجود چودہ سو سالوں میں 'علما' کے تعامل کے اس مخصوص پیٹرن (Pattern) کا جائزہ اس بحث کو بے جا طویل اور دشوار بنا دے گا چنانچہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صرف گزشتہ تین سو سالوں کے پیٹرن کا جائزہ لے لیا جائے وہ بھی نہایت مختصر۔ مختصراً اس لئے کہ آج کا کوئی بھی عام مسلمان کسی نہ کسی قدر ان باتوں سے بخوبی واقف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض کے پاس اس کا مبسوط اور مفصل علم ہے تو بعض کے پاس مختصر اور مجمل۔

۲۔ گزشتہ تین سو سالوں میں 'علما' کے تعامل (فکر و عمل) کے پیٹرن کی حرکیت میں دو باتیں بے حد نمایاں ہیں:

ا۔ **حوادث سے مکمل بے خبری:** چنانچہ ہر نئی شے اور حادثہ سے اولاً علما کا اغماض۔ اور ہر اغماض کی صورت اس سے بدگمانی اور وحشت: 'علما' کا یہ ایک عجیب وغریب اور ناقابل فہم پیٹرن (Pattern) اور اس کی حرکیت (Dynamics) ہے۔ غور کرنے سے اس کا علم ہوتا ہے کہ اس پورے پیٹرن کی بنیاد 'لاعلمی' یا 'بے خبری' ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ 'لاعلمی' یا 'بے خبری' مجرد لاعلمی یا بے خبری ہوتی تو چنداں قابل تشویش نہیں تھی۔ مجرد لاعلمی یا بے خبری عام انسانی خاصہ ہے۔ ہم سب زندگی کے بہت سارے امور، حوادث اور حقائق سے عموماً لاعلم یا بے خبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر لمحے زندگی کی عملیت اور حرکیت ہمیں اس آزمائش سے دوچار کرتی رہتی ہے اور ہم فوراً باخبر ہو جاتے ہیں کہ فلاں بات سے ہم اب تک لاعلم اور بے خبر تھے۔ بے خبری اور لاعلمی معمولی اور عام باتوں کی ہوسکتی ہے اور اہم باتوں کی بھی۔ تیس سالوں قبل کی بات ہے عاجز پہاڑی بھوجلہ میں اہل علم کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا۔ عاجز نے حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ سید محمد امیر المعروف بہ میر پنجہ کش کا مزار کہاں ہے؟ عاجز کا خیال تھا کہ وہ جس جگہ بیٹھا ہے اسی کے آس پاس کہیں ان کا مزار ہے۔ حاضرین مجلس نے جواب دیا ہمیں نہیں معلوم یہاں کوئی ایسی قبر ہے۔ جب عاجز نے انھیں بتایا کہ وہ ایک یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ 1857 میں شہید ہوئے اور پہاڑی املی پر مدفون ہیں تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اس طرح کبھی لاعلمی یا بے خبری بسیط ہوتی ہے۔ لیکن جب انسان ایسی بسیط لاعلمی اور بے خبری پر متنبہ ہوتا ہے تو تحقیق کے بعد اس کی یہ لاعلمی اور بے خبری بھی دور ہو جاتی ہے۔ لیکن لاعلمی اور بے خبری کی ایک اور نادر مگر مہلک قسم پائی جاتی ہے جس میں مبتلا انسان ہزاروں بار متنبہ ہونے کے باوجود متحرک اور مائل بہ جستجو و تحقیق نہیں ہوتا۔ یہ لاعلمی اور بے خبری اس شخص کے اندر پائے جانے والے ایک قسم کے 'کاذب علم' سے راسخ ہو جاتی ہے۔ جب کوئی طریقۂ تعلیم کسی انسان کو 'اعلم' اور سب کچھ جاننے والا قرار دے دیتا ہے تو وہ اس قسم کے 'کاذب علم' کے فریب بلکہ سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ چودہ سو سالوں سے 'علما' کا رائج کردہ 'علم' جو مدرسوں میں یا علما کے ذریعہ دیا جاتا رہا ہے اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ مدارس میں دیا جانے والا علم انسانی دماغ کو صدفی صد مکلیف (Conditioned) کر دیتا ہے۔ اس کی فی الواقع وہی حالت ہو جاتی ہے جو 'اسمیک' کے نشے کے عادی انسان کی ہوتی ہے جسے اپنے ماحول اور اس کے حوادث کی خبر ہوتی ہے اور نہ پرواہ۔ چودہ

سو سالوں سے 'علما' اور ان کے مدارس ایک ایسے 'علم' سے مسلمانوں کو سیراب کرتے رہے ہیں جن کی حالت دیکھ کر 'جہل مرکب' بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ مدرسوں کا نظام تعلیم کسی متوازی طریقۂ علم سے کوئی اعلیٰ وارفع علم نہیں دیتا بلکہ انسان کی دماغی صلاحیتوں مثلاً قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو یکسر معطل اور مفلوج کر دیتا ہے۔ سوال اس کا نہیں کہ مدرسوں میں جاری نظام تعلیم طلبہ کو علم طبیعیات اور علم کیمیا کیوں نہیں سکھاتا؟ کاش بات اتنی ہی ہوتی! بدقسمتی یہ ہے کہ مدارس میں ایک ایسا 'کاذب علم' دیا جاتا ہے کہ اس علم سے بہرہ ور ہوتے ہی انسان قرآن اور احادیث کے فہم، اس میں درک اور اس میں تحقیق کی ہر قوت سے مستقل طور پر معطل اور مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ مدارس کے اس علم سے بہرہ مند انسان قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے پڑھنے، اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت لینے کی صلاحیت، استعداد، طلب، آمادگی اور ہمت سے ہی محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تعلیم دراصل اس کی انسانی 'فطرت' اور 'جبلت' کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کی مستقل اور مکمل معطلی نے پچھلے چودہ سو سالوں سے ان مدارس سے تعلیم حاصل کر کے نکلنے والے 'علما' کو کس درجہ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اس کی مثالیں ہمارے 'ذخیرۂ علم' میں ہزاروں مقامات پر بکھری مل جائیں گی۔ عاجز یہاں صرف تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہے جن میں ایک قرآن کی ہے، دوسری حدیث کی ہے اور تیسری تاریخ کی ہے۔ چودہ سو سالوں سے 'علما' کو ان کے معانی سمجھنے اور ان کی تحقیق کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

۱۔ قرآن کی مثال: لِاِیلٰفِ قریش۔ اِلٰفھم رحلة الشتاء والصیف (قریش: ۱۔۲)

۲۔ حدیث کی مثال: حدثنا موسیٰ حدثنا عبد الواحد حدثنا کلیب حدثتنی ربیبة النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اظنھا زینب قالت نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الدباءِ و الحنتم و المقیر و المزفت و قلت لھا اخبر ینی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ممن کان من مضر کان؟ قالت: فمن کان إلاّ من مضر. کان من ولد النضر بن کنانہ۔ (بخاری: کتاب المناقب)

۳۔ تاریخ کی مثال:

ألا أیھا الشاروں قدحان لِأ مریءٍ

شری نفسه لِلله ان یتر حّلا

(تاریخ طبری: ۳)

چنانچہ چودہ سو سالوں سے رائج کردہ یہ طریقۂ تعلیم وہ منبع شر ہے جس نے مسلمانوں کی قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو مستقل اور مکمل طور پر مفلوج و معطل کر کے اذہان کو مکیف (Conditioned) کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر نئے حادثے پر اس ذہن کی حرکیت (Dynamics) مکمل کنارہ کشی حتیٰ کہ آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہر نئی شے کو پرکھنے اور جاننے کو حرام قرار دیتی ہے۔ فطرت کی جانب سے قلب و نظر میں اٹھنے والے ہر سوال کو سختی سے دبا دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقۂ علم کی راہ میں قرآن 'علما' کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہر لمحے انسان کی قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو مہمیز کرتا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ 'علما' عام طور پر قرآن سے مواجہ پر سخت متوحش ہوتے ہیں اور اس سے حصول برکت و ثواب سے زیادہ میل جول رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ 'علما' قرآن سے دور کی صاحب سلامت میں عافیت سمجھتے ہیں۔ قرآن انسان کو غور و فکر کے لئے ہمیشہ مہمیز کرتا ہے:

۱۔ واللہ اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شئیا و جعل لکم السمع والا بصار والأفئدہ لعلکم تشکرون (النحل ۷۸)

قرآن ان سے کام لینے کا حکم فرماتا ہے:

(الف) انظر إلی العظام کیف ننشزھا (البقرۃ ۲۵۹)

(ب) فسیروا فی الأرض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین (النحل ۳۶)

(ج) الم ترإلی ربك کیف مد الظل ولو شاء لجعلہ ساکنا (الفرقان ۴۵)

جو لوگ قوت متخیلہ، قوت مدرکہ اور قوت وجدانیہ کو معطل کر دیتے ہیں ان سے قرآن شکایت کرتا ہے:

۱۔ وھو الذی انشا لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون (المومنون ۷۸)

چنانچہ چودہ سو سالوں سے مدارس میں ایک ایسا طریقۂ تعلیم رائج ہے جس نے قرآن کو مسلمانون کی زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لاعلمی اور بے خبری کو دور کرنے کے لئے سوال، مشاہدہ اور مناظرہ 'علما' کے ذریعہ عقیدے کا مسئلہ قرار دے کر حرام قرار دیئے جاتے رہے ہیں۔ ہر نئے حادثے سے باخبر ہونے والا اور سوال، مشاہدہ اور مناظرہ کرنے والا اول وہلہ میں 'علما' کے ذریعہ کافر، زندیق اور مرتد قرار دے دیا جاتا ہے۔

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ پچاس سے سو سال کے اندر اندر وہی 'علما' بغیر کسی دلیل کے اس حرام قرار دی گئی شئے کو از خود حلال قرار دے دیتے ہیں۔ بلکہ خود اس کے حق میں دلیل دے کر انھیں جائز اور

حلال قرار دے دیتے ہیں۔

۲۔'علما' کے یہاں حرام سے حلال تک کے سفر کی تدریج: 'علما' کے تعامل کا یہ دوسرا جز ہے۔ اس جز کے دو ذیلی پیٹرن ہیں:

۱۔ ہر شئے پہلی نظر میں 'حرام' قرار پاتی ہے پھر رفتہ رفتہ وہ از خود 'حلال' ہو جاتی ہے۔

۲۔ متقدمین کی ہر 'حرام' کردہ 'شی' اور 'حکم' متاخرین کے ذریعہ بلا دلیل 'حلال' ہو جاتی ہے۔

چنانچہ پہلے ذیلی پیٹرن کے مطابق ہر نئی شئے یا امر 'پہلی نظر میں' 'حرام' پھر پچیس سے پچاس سالوں میں 'مکروہ'۔ اگلے پچاس سالوں میں 'جائز بالکراہت'، پھر اگلے پچاس سالوں میں 'جائز' اور اکثر اوقات 'مندوب' اور 'واجب' ہو جاتی ہے۔

دوسرے ذیلی پیٹرن کے مطابق متقدمین یا سابقین فقہ میں موجود دلیلوں سے جن چیزوں اور جن امور کو 'حرام' قرار دیتے ہیں متاخرین یا لاحقین اسی فقہ کی دلیلوں سے انھیں 'حلال' اور 'اَحسَن' قرار دے دیتے ہیں۔

۳۔ چنانچہ چودہ سو سالوں کے اس تعامل کو دیکھ کر دو سوالات دماغ میں آتے ہیں:

۱۔ کیا متقدمین اسلام سے ناواقف تھے یا متاخرین ناواقف ہیں؟

۲۔ کیا فقہ واقعی کوئی علم ہے یا کوئی ایسا آلہ جس کے ذریعہ اسے برتنے والا اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق جب چاہے کسی حلال شئے کو حرام قرار دے دے اور جب چاہے کسی حرام شئے کو حلال؟

صرف گزشتہ تین سو سالوں میں 'علما' کے یہ دو پیٹرن اتنے نمایاں اور ان کی یادیں ابھی ساٹھ ستر سال کی عمر والوں کے حافظے میں اتنی تازہ ہیں کہ آج کا ہر مسلمان انھیں بخوبی جانتا ہے یا بآسانی جان سکتا ہے:

(الف) اول الذکر کی مثالیں: تصویر (Picture)، فوٹو گرافی، ٹیلی فون، انگریزی تعلیم، تھری پیس سوٹ، ٹیبل پر کھانا کھانا، ریڈیو، ٹیلی ویژن، مائک پر اذان دینا اور نماز کی ادائیگی، گھڑی باندھ کر نماز، موبائیل، ہوائی جہاز پر نماز کی ادائیگی، بغیر محرم کے خواتین کا سفر کرنا وغیرہ۔

(ب) ثانی الذکر کی مثالیں: سود لینا اور دینا، سودی کاروبار کرنا، بینک سے استفادہ کرنا، اسلامی بینک کاری کے نام پر پورے بینکنگ نظام کو اختیار کر لینا، شیئر بازار سے مکمل استفادہ کرنا، دارالاسلام اور دارالحرب کے سارے قوانین کو نافذ رکھنا پھر یکسر کالعدم قرار دے دینا، خون اور انتقال خون (Blood & Blood Transfusion) سے استفادہ کو جائز کر دینا، اعضا کی پیوندکاری (Organ Transplantation)

اور مصنوعی طور پر حاملہ ہونے (Artificial Insemination) وغیرہ کو جائز کر دینا۔

اگر صرف تین سو سالوں کے اس پیٹرن پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے سارے احکام کے جواز اور عدم جواز کا تعلق قرآن وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ علما کی 'معلومات' اور اس سے زیادہ ان کے 'مزاج'، 'پسند' اور 'قبولیت' سے رہا ہے۔ آخر قرآن نے 'اربابا من دُونِ اللہ' کا اور کیا مطلب لیا ہے؟

۴۔ اب جہاں تک 'علما' کے مزاج، ان کی معلومات اور ان کی قبولیت کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ ان امور کا تعلق ان کے ذہن (Mind) اور دماغ (Brain) سے ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ 'علما' کے ذہن (Mind) کی کیا خصوصیات ہیں اور ان خصوصیات کی جڑ کہاں ہے؟ علما کے ذہن (Mind) اور دماغ (Brain) کا دقیق جائزہ بتاتا ہے کہ وہ تین خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ جب مسلم معاشرہ صد فی صد مکیف (Conditioned) تھا اور اب جب کہ وہ تکییف (Conditioning) کلی طور پر ختم ہو چکی ہے دو الگ کیفیات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ جب مسلم معاشرہ صد فی صد مکیف تھا تو 'حوادث' سے بے خبری اور لاعلمی کو گوشۂ عافیت بآسانی میسر ہو جاتی تھی۔ لیکن اس صورتحال کے ختم ہو جانے کے بعد اب مسلم معاشرہ کھلی دھوپ میں ہے اور 'علما' انھیں مکیف رکھ کر فطری طور پر ان کے اندر پیدا ہونے والے سوال، مشاہدہ اور مناظرہ سے انہیں الگ نہیں رکھ سکتے۔ مذکورہ تین خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ شدید علمی پس ماندگی (Intense Epistemological Backwardness)

۲۔ شدید ادراکی پس ماندگی (Intense Intellectual / Ontological Backwardness)

۳۔ شدید ماضی وابستگی (Intense Past-Attachment)

'علما' کے اندر شدید ماضی وابستگی کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ شدید ماضی وابستگی (جارحَانہ)

۲۔ شدید ماضی وابستگی (اِنفعَالی)

'علما' کے ذہن (Mind) اور دماغ (Brain) کی یہ تینوں خصوصیات تاریخ میں امت کے لئے ہمیشہ مضر بلکہ مہلک ثابت ہوئیں۔ ان تینوں خصوصیات کے دباؤ میں مسلم معاشرے میں گزشتہ چودہ سو سالوں میں اذہان اور ان کے افکار اور اعمال کے رد اور قبول درج ذیل دو احوال کے شکار ہو کر رہ گئے۔

۱۔ امتِ مسلمہ میں پیدا ہونے والے تمام ذہنی، فکری، علمی عباقرہ اور خلّاق افراد 'علما' کے ذریعہ

زِندیق اور کافر قرار پائے چنانچہ ایسے افرادامت کا افادہ کر سکے نہ امت ان سے استفادہ کر سکی۔

۴۔امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے تمام ذہنی اور فکری طور پر غبی اور علمی طور پر پس ماندہ اور بلید ایسے افراد جن کی 'فطرت' مسخ ہو چکی تھی 'اِمام' اور 'مُجَدِّد' قرار پائے۔

۵۔گزشتہ چودہ سو سالوں کے دوران متمکن ہو جانے والے ان 'علما' کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل امور کا ادراک ہوتا ہے:

ا۔امت مسلمہ کو چودہ سو سالوں تک مکیف (Conditioned) بنائے رکھنے کے تنہا ذمہ دار 'علما' ہیں۔

۲۔'علما' نے 'حکمراں۔علما تعہد' کے تحت چودہ سو سالوں تک امت کو حکمرانوں کے لئے منضبط (Regulated) رکھنے میں بلاشرکت غیرے کردار ادا کیا۔

۳۔'علما' نے ان چودہ سو سالوں کے دوران امت مسلمہ کو اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حقیقی دین اللہ سے دور رکھا اور ان کے اور امت مسلمہ کے مابین پہاڑ بن کر سد راہ بنے رہے۔

۴۔'علما' نے اسلام کو اجنبی (غریب) بنا دیا اور امت مسلمہ کے حقیقی اسلام سے باخبر ہونے کی ہر راہ بند کر دی۔

۵۔نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ 'ھدیٰ' کو 'علما' نے امت مسلمہ میں 'مجوب' بنا دیا۔قرآنی علم، تعلیم، تعلم، تحقیق، تمحیص، تفحص اور مذاکرہ کو ممنوع قرار دے کر قرآن کو 'مھجور' بنا دیا۔

۶۔'علما' نے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کو مٹا کر اس کی جگہ جعلی سنت رائج کی۔ امت مسلمہ کے لئے سنت رسول پر چلنا مشکل بنا کر اس کی بحالی کو دشوار تر بنا دیا۔

۷۔'علما' نے چودہ سو سالوں سے امت کو پستی اور اضمحلال کی جانب دھکیلنے میں مفسدین کی مدد کی چنانچہ امت پر بتدریج امارت، ملوکیت، کاٹ کھانے والی بادشاہت، جبر اور ظلم والی بادشاہت اور فساد فی الارض عارض ہوتے چلے گئے۔

۸۔'علما' نے امت مسلمہ کے ذہن اور دماغ کو پس ماندگی کا عادی اور خوگر بنا دیا۔

۹۔'علما' نے امت مسلمہ کے ذہن اور دماغ کو قبل از وقت، بر وقت حتیٰ کہ بعد از وقت بھی فیصلہ لینے کے لائق نہیں رہنے دیا۔

۱۰۔'علما' نے امت مسلمہ کو عملاً پس رو (Lagging) بنا کر طبعاً پس رو (Limping) بنا دیا۔

۱۱۔'علما' نے امت مسلمہ کو کبھی قرآنی تحقیق اور تدبیر کا سہارا لے کر Quantum Jump لینے یا Change of Scale کرنے کی اجازت نہیں دی۔

۱۲۔'علما' نے پچھلے پچاس سالوں میں بالعموم اور حالیہ بیس سالوں میں بالخصوص امت مسلمہ کو تمام استعماری (Colonial) اور سرمایہ دارانہ قوتوں (Capitalistic Forces) کے مظالم کا شکار بنانے میں سب سے بڑے آلۂ کار کی حیثیت سے کردار ادا کیا۔ یہ بات آج ہر باخبر انسان پر واضح ہے کہ گزشتہ بیس سالوں میں عالمی استعماری قوتوں (Global Colonial Powers)، عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی قوتوں (Global Capitalistic System's Forces)، بڑے بڑے ملٹی نیشنل کارپوریشنز (Giant Multi-national Corporations)، اور عالمی بزنس ہاوسز (Global Business Houses) کے عالمی بازار (Global Market) کو وسعت دینے اور مستحکم کرنے کے لئے 'فقہ اکادمیوں' (Fiqh Academies) نے سب سے بڑا رول ادا کیا ہے جس میں 'علما' نے بڑھ چڑھ کر 'فقہ' کی خدمت کی۔

۶۔ یہ تمام وہ امور ہیں جن کے بارے میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ صحابۂ کرام ان تمام باتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان میں چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ وعن سفیان ان عمر بن الخطاب قال لکعب: من ارباب العلم؟ قال: الذین یعملون بما یعلمون۔ قال: فما اخرج العلم من قلوب العلماء؟ قال: الطمع۔ (رواہ الدارمی)

ترجمہ: حضرت سفیان نے فرمایا: پوچھا حضرت عمر نے حضرت کعب سے: صاحبان علم کون ہیں؟ کعب نے کہا: جو علم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ پوچھا عمر نے: کیا چیز علم کو علما کے قلب سے نکال دیتی ہے؟ کعب نے جواب دیا: لالچ۔

۲۔ وعن الاحوص ابن حکیم عن ابیہ قال: سئل رجل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الشر۔ فقال: لاتسئلونی عن الشر و سلونی عن الخیر۔ یقولها ثلثا۔ ثم قال: آلا ان شر الشر شرار العلماء وإن خیر الخیر خیار العلماء۔ (رواہ الدارمی)

ترجمہ: حضرت احوص بن حکیم نے روایت کی اپنے والد سے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے بارے میں معلوم کیا تو آپؐ نے فرمایا: مجھ سے شر کے بارے میں نہیں بلکہ خیر کے

بارے میں پوچھو۔ یہ کلمات آپؐ نے تین بار فرمائے۔اس کے بعد فرمایا: برے میں سب سے برے بھی علما ہیں اور اچھے میں سب سے اچھے بھی علما ہیں۔

۳-وعن علی قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یوشك ان یاتی علی الناس زمان لایبقیٰ من الاسلام إلاّ اسمه ولا یبقیٰ من القرآن إلاّ رسمه. مساجدهم عامرة وهی خراب من الهدیٰ. علمائهم شر من تحت ادیم السماء من عندهم تخرج الفتنة و فیهم تعود. (رواه البیهقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت علی نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: قریب ہے کہ لوگوں پر ایسا دور آئے گا جس میں اسلام نام کے لئے باقی رہ جائے گا اور قرآن کی رسم باقی رہ جائے گی۔ مسجدیں آباد تو ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔ اور اس دور کے علما آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے ان سے فتنے ظاہر ہوں گے اور وہ فتنے انھیں پر لوٹیں گے۔

پس چہ باید کرد

ا۔ ہندوستان میں امت مسلمہ بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بالخصوص اب 'جاں کنی' (Agony of Death) میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ بعض لوگوں کو ان کے ظاہری احوال اور چہرے کی بشاشت اس 'تشخیص' کے ماننے میں حارج ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس پر حیرت اور بعض کو اس سے انکار بھی ہو۔ لہذا عاجز کے ''پس چہ باید کرد'' کو بخوبی سمجھنے کے لئے ان کے حقیقی احوال کا ادراک نہایت ضروری ہے۔ اس 'جاں کنی' [ملاحظہ فرمائیں: محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: خدا بخش لائبریری جرنل:50؛ صفحہ 113] کی تشخیص کو دو عنوان کے تحت یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

ا۔ ہندوستان میں امت مسلمہ کو فی زمانہ قوتی (Potential) اور حقیقی (Actual) وجود (Existence) اور بقا (Survival) کے مسائل درپیش ہو چکے ہیں۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو فی زمانہ قوتی (Potential) اور حقیقی (Actual) وجود (Existence) اور بقا (Survival) کے مسائل درپیش ہو چکے ہیں۔

۲۔ ہندوستان میں آج بالعموم امت مسلمہ، بالخصوص اس کے اداروں اور بالاخص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے وجود کو باقی رکھنے والی ہر موثر قوت اور صورت بظاہر مفقود ہو چکی ہے۔ درایں حالت جیسی حقیقی اور برسرزمین صورتِ حال درپیش ہے وہ کسی اصلاح حال کے امکان کو کلیۃً 'خارج از تصور' بنا دیتی ہے۔

اس صورتحال اور اس کی حرکیت (Dynamics) میں موثر داخلی عوامل کی Juxtapositioning اور Interaction کو یوں ملخص کیا جاسکتا ہے:

(الف) 'علما' کی طبع: امتِ مسلمہ میں 'علما' کی حقیقی موجودگی ناقابلِ انکار ہے۔ ان کی قوت 'موثر' ہے۔ ان کی رسائی ہمہ گیر نہیں تو کم از کم افقی طور پر اور بالخصوص ذیلی طبقے کی حد تک 'صد فی صد' ہے۔ لیکن بایں ہمہ تاریخ گواہ ہے کہ وہ طبعاً فکر، تدبیر اور تعمیل ہر سہ محاذ پر جامد (Rigid)، منفی (Negative)، سلبی (Passive)، حارج (Obstructionist) اور ناقابلِ تبدیل (Unchanging) ہوتے ہیں۔ خواہ ان کے الفاظ و بیان بظاہر اس کی کیسی ہی تردید اور ان کے حرکات وتگ ودو بظاہر اس کی کیسی ہی نفی کرتے ہوں۔

(ب) 'علما' کی نفسیات: 'علما' کی نفسیات میں ایک عجیب و غریب بات پائی جاتی ہے۔ چنانچہ امت کی چودہ سو سالہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ مسلم معاشرے میں بالعموم اور عامۃ المسلمین میں بالخصوص اپنے اثر، تفوق اور گرفت کی اجارہ داری (Monopoly) کو مستحکم کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے جہاں ایک جانب مداخلت جا و بے جا سے 'علما' کبھی دست بردار نہیں ہوتے وہیں دوسری جانب اپنے اہداف کو پورا کرنے کے لئے وہ خیر و شر کی ہر موجودہ قوت سے مفاہمت اور معاملت کر سکتے ہیں۔ اپنے اس تعامل کے لئے عام طور پر وہ 'فقہ' کا بھرپور استعمال کر کے حلال کو حرام اور حرام کو حسب خواہش و ضرورت اپنے لئے حلال بنا دیتے ہیں۔ 'مذہب' ان کے نزدیک عوام کے لئے 'عقیدہ' اور ان کے لئے 'آلہ' (Instrument) کا درجہ رکھتا ہے۔

(ج) 'علما' اور دین اللہ: انسانی تاریخ بالعموم اور مسلم تاریخ بالخصوص اس کی شاہد ہے کہ 'علما' 'دین اللہ مخالف' اور 'مذہب موید' واقع ہوئے ہیں۔ 'علما' کی ہمیشہ وابستگی 'دینِ آبا یا دینِ ماضی' کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ ان کا یہ 'دین' ہر دور میں ایک 'قالب' اختیار کر لیتا ہے جسے 'دین عاجلہ' کا قالب کہا جا سکتا ہے۔ ان کا 'دین آبا یا دین ماضی' ہر دور میں 'دین عاجلہ' کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ 'دینِ آبا یا دینِ ماضی' اور 'دین آخرت' میں بعد المشرقین ہے۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین۔۔ حقیقی اسلام۔۔ 'دینِ آخرت' ہے۔ ظاہر ہے ایسے اسلام کو 'علما' کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟

۳۔ مروجہ قیادت: مسلمانوں میں فی زمانہ 'قیادت' کا Infrastructure 'عالمانہ' (Alimatic) ہے۔ اس کے Superstructure میں خواہ کسی طبقے اور ذہن کی نمائندگی کیوں نہ ہو وہ محض سطحی اور

نمائشی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی 'موجودہ قیادت' درج ذیل احوال سے گزر رہی ہے:

۱۔ موجودہ قیادت قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) بے بصیرت (Visionless) ہوچکی ہے۔

۲۔ موجودہ قیادت قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) بدذہن (Mindless) ہو چکی ہے۔

۳۔ موجودہ قیادت قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) ناتواں (Impotent) ہوچکی ہے۔

۴۔ موجودہ قیادت قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) عاجز (Incapacitated) ہوچکی ہے۔

۵۔ موجودہ قیادت قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) بے اثر (Ineffectual) ہوچکی ہے۔

۶۔ موجودہ قیادت اپنی عصمت (Integrity) کھوچکی ہے۔

۷۔ موجودہ قیادت مزاجاً اور عملاً طفیلی (Parasitic) ہوچکی ہے۔

۸۔ موجودہ قیادت حقیقۃً ناقابلِ اعتماد (Unfaithful) ہوچکی ہے۔

۴۔ ایسی صورتحال میں جب کہ مذکورہ اسباب سے امتِ مسلمہ بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بالخصوص 'جاں کنی' میں مبتلا ہوچکی ہیں اصلاحِ حال کی 'موثر' (Effective)، تیر بہ ہدف (Accurate) اور کافی (Adequate) کوششیں اگر بروقت نہ کی گئیں تو عن قریب حادثات فاجعات کا ظہور یقینی ہو جائے گا۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو اس کے عواقب دو شکلوں میں برآمد ہوں گے:

۱۔ امتِ مسلمہ میں اسلامی حیویت (Vitality) کی قوۃً (Potential) اور حقیقۃً (Actual) موت واقع ہوجائے گی۔

۲۔ امتِ مسلمہ میں انسانی حیویت (Vitality) کی قوۃً اور حقیقۃً موت واقع ہوجائے گی۔

۵۔ یہ بات ذہن میں واضح رہنی چاہیئے کہ آئندہ اندیشوں (Eventualities) اور امکانات (Opportunities) میں ترجیح (Preference) کا تعلق پسند و ناپسند سے اب قطعاً مربوط نہیں۔

اندیشوں (Eventualities) کی نازکی کسی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے امکان یعنی اختیار و انتخاب (Choice) کو کلیۃً رد کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس نازکی کو درج ذیل دو جہات سے واضح کیا جاسکتا ہے:

ا۔'اصلاحِ حال کے لئے آئندہ کیا کیا جائے (؟) اور اس کے لئے کن تجویزوں کا انتخاب ہو(؟)' کا دارومدار اب اختیار (Choice) پر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ مسئلہ انتظام (Maintenance) کا ہے نہ ارتقا (Growth & Development) کا۔

۲۔'اصلاحِ حال کے لئے آئندہ اختیار کئے جانے والے طریقوں اور اٹھائے جانے والے اقدام' کا تعلق بالکلیہ وجود (Existence) اور بقا (Survival) کے مسئلے سے ہے چنانچہ ایسی صورتحال میں اختیار کے تحت صرف ایک ترجیح پیش نظر رکھی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ آخر وہ کون سی صورت ممکن اور موثر ہے جس سے وجود (Existence) اور بقا (Survival) یقینی بن جائیں؟

۶۔ اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں واضح رہنی چاہیئے کہ امت مسلمہ اور اس میں موجود افراد، اجتماعیات اور اداروں کی حقیقی صلاحیت (Capability) اور استعداد (Faculty)، ان کی تاثیر (Effectiveness) اور بارآوری (Productivity) کی حقیقی صورتحال کیا ہے؟ مزید ازیں ان افراد، اجتماعیات اور اداروں کی طبع اور عادت میں کتنی آمادگی (Urge) اور لگن (Earnestness) پائی جاتی ہیں۔ از روئے حقیقت امت میں موجود افراد، اجتماعیات اور اداروں کی موجودہ صورتحال ذیل میں یوں ملخص کی جاسکتی ہے:

ا۔ امت میں موجود نمائندہ افراد، اجتماعیات اور ادارے صلاحیت اور استعداد کے اعتبار سے قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) صفر ہو چکے ہیں۔

۲۔ امت میں موجود ان نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کی تاثیر یا موثریت (Effectiveness) اور بارآوری (Productivity) ناکافی (Inadequate) ہو چکی ہیں۔

۳۔ اصلاحِ حال کے حوالے سے امت کے نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کا عزم (Determination) اور ان کی آمادگی (Urge) صفر ہو چکی ہیں۔ امت کے ان نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کی حقیقی صورتحال اتنی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ اگر روئے ارض کی اعلیٰ اور ارفع ترین تفکیر (Vision) اور اعلیٰ و ارفع ترین تدبیر (Strategy) اور منہاج (Methodology) بھی انھیں فراہم کر دیئے جائیں جب بھی وہ ان کی تعمیل (Execution) نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر اس سے بھی آگے

کی بات کہہ دی جائے کہ اگر کوئی ان کے لئے تعمیل (Execution) کر کے اس کے ثمرات ان کے حوالے بھی کر دے تو وہ اتنی بھی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان ثمرات سے بھر پور استفادہ کر لیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں مشرق وسطیٰ سے درآمد کردہ پیٹروڈالر کے ثمرات کا امت کے نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں نے جو مصرف لیا ہے اور ان ثمرات سے جس طرح استفادہ کیا ہے اس سے زیادہ مُوضّح مثال تقریبِ فہم کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟

۴۔ امت میں موجودہ نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کی اس نازائی (Unproductiveness) کے پس پردہ دو عوامل کارفرما نظر آتے ہیں:

۱۔ 'مسلم قیادت'

۲۔ 'علما'

یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ 'مسلم قیادت' اصلاً 'عالمانہ' (Alimatic) ہے جس کے اندر مذکورہ دو طبقے شمار ہوتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں اول الذکر صرف Superstructure اور Facade ہے جب کہ موخر الذکر وہ اصل قاعدہ (Infrastructure) ہے جس پر اول الذکر 'قیادت' ایستادہ ہے۔ بالفاظ دیگر 'مسلم قیادت' کی نازائی (Unproductiveness) کا بنیادی سبب امتِ مسلمہ کی 'عالمانہ قیادت' (Alimatic Leadership) ہے۔

چودہ سو سالہ مسلم تاریخ شاہد ہے کہ یہ عارض 'عالمانہ قیادت' (Alimatic Leadership) امت کے لئے ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ 'علما' کی خواہشات، ان کی سفارشات، ان کی تجویزیں، ان کا طرز عمل اور بعض اوقات ان کی باضابطہ اور راست عملی کارروائیاں امت کے لئے ہلاکتیں لے کر آئیں۔ 900 عیسوی کے بعد اس کا بنیادی سبب عام مسلمانوں کے علم، ان کی معلومات، ان کے ذہن اور ان کے رجحانات کا پوری طرح مکیف (Conditioned) ہونا لگتا ہے۔ گزشتہ تین سو سالہ تاریخ ایسے کئی دلدوز مناظر پیش کرتی ہے جب 'علما' کی سفارشات، تجویزیں، ان کا طرز عمل اور ان کی باضابطہ مداخلت اور عملی کارروائیاں امت کے لئے صرف اور صرف تباہیاں لے کر آئیں جن کی ہلاکت خیز مضمرات اور عواقب سے امت آج تک نجات نہیں پا سکی ہے۔

[۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) شاہ ولی اللہ دہلوی: حجۃ اللہ بالغہ: باب سیاسۃ المدنیہ،

(ب) شاہ ولی اللہ دہلوی: تفہیمات جلد اول۔

(ج) محمد عاشق پھلتی: القول الجلی فی ذکر آثار الولی۔

(د) پروفیسر خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ندوۃ المصنفین، دہلی۔

[۲۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) فتاوی عزیزیہ (فتاوای شاہ عبدالعزیز دہلوی)،

(ب) شاہ عبدالعزیز دہلوی: فتح العزیز جلد اول، دوم وسوم،

(ج) شاہ عبدالعزیز دہلوی: سر الشھادتین،

(د) شاہ عبدالعزیز دہلوی: تحفۂ اثنا عشریہ۔

[۳۔ جمال الدین افغانی کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) E.G. Brown: The Persian Revolution of 1905-1909, Cambridge, 1910

(ب) سید رشید رضا: تاریخ الأستاذ الامام محمد عبدہ: جلد اول ودوم: قاھرہ 1931-44۔

(ج) Charles. C. Adam: Islam And Modernism in Egypt, London 1933.

[۴۔ شیخ محمد عبدہ کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) سید رشید رضا: تاریخ الأستاذ الأمام عبدہ: قاھرہ 1931-44۔

(ب) محمد عبدہ: رسالۃ التوحید،

(ج) محمد عبدہ: شرح نھج البلاغہ،

(د) محمد عبدہ: شرح مقامات الھمذانی،

(ہ) محمد عبدہ: تقریر الإصلاح المحاکم الشرعیہ،

(و) محمد عبدہ: الإسلام و النصرانیۃ،

(ز) احمد الشایب: الشیخ محمد عبدہ: مکتبۃ الاسکندریۃ 1929۔

(ح) عبد العزیز الدسوقی: تطور النقد العربی الحدیث فی مصر: قاھرہ 1977۔

(ط) مصطفی لطفی المنفلوطی: مؤلفات مصطفی لطفی المنفلوطی: جلد اول و دوم: بیروت 1980۔

[۵۔ سید رشید رضا (ف 1935) کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف)سید رشید رضا: مجلة المنار،

(ب)سید رشید رضا: تفسیر المنار، بیروت۔

[۶۔ یحییٰ بن محمد بن حمید الدین الحسنی (1948-1869) کی سفارشات، تجویزوں، طرزِ عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) P. Dresh: Tribes, Government And History in Yemen, Oxford, 1993.

۷۔ چونکہ امت مسلمہ تفکیر (Vision)، عزم (Determination)، آمادگی (Urge)، تدبیری جوارح کی فعالیت (Efficaciousness of the Strategic Instruments and Institutions) اور تعمیلی جوارح کی فعالیت (Efficaciousness of the Executive Instruments) بالکل کھو چکی ہے اس لئے درایں حالت صرف ایک ممکنہ راہ نظر آتی ہے۔ امت کی 'اصلاحِ حال کے لئے خارجی مدد' کو بروئے کار لانا۔

۸۔ اس مقام پر کسی بھی ذہن میں چند بنیادی سوالات کا پیدا ہونا لازمی ہے: نفس 'مذہب' کیا ہے؟ اس کے علمبردار نفس 'علما' سے کیا مراد ہے؟ یہ کون ہوتے ہیں؟ کیوں ہو جاتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ اس دنیا میں ان کا کیا مقام ہے؟ انسانی معاشرے میں ان کا تاریخی رول کیا رہا ہے؟

ا۔ روئے ارض پر پہلی بار جب آدم و حوا بسائے گئے اور ان سے ان کی اولادیں پھیلیں تو بنی آدم پر عارض ہونے والا سب سے پہلا 'انسان۔ تحملی مہلکۃ' (Human-borne Calamity & Fatality) 'مذہب' تھا۔ یہ وہی 'مہلکۃ' ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے الجنۃ سے روئے زمین تک کے سفر پر عازم ہونے سے پہلے آدم اور پھر حوا کو باخبر اور خبردار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ ۳۸)

ترجمہ: پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ھدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے مزید تاکید فرمائی:

والذین کفروا و کذبوا بایٰتنا اولئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون (البقرہ ۳۹)

ترجمہ: اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ اس میں

ہمیشہ رہیں گے۔

ظاہر ہے کسی ایسے 'مہلکۃ' کا منبع، مصدر اور مرجع 'ابلیس' کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

۲۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو روئے ارض پر آئندہ درپیش ہونے والے جس 'مہلکۃ' کے ظہور سے آگاہ کیا تھا وہ بالآخر سچ ثابت ہو کر رہا۔ چنانچہ 'ھدیٰ' سے مزود (Equipped) ہونے کے باوجود ابلیس کی مداخلت سے بنی آدم زمین پر اس 'مہلکۃ' کا شکار ہو گیا۔ اس مداخلت کے سبب بنی آدم کے ارضی حیات کے جسد میں ایک Outbuilding کا ظہور ہوا جس نے دیکھتے دیکھتے اس کے جسد میں باضابطہ Outgrowth کی پوزیشن اور صورت لے لی۔ یہی Outbuilding جس نے باضابطہ Outgrowth کی صورت اختیار کر لی تھی 'مذہب' (Religion) کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ 'مذہب' (Religion) کا محل تو انسانی ذہن (Mind) تھا لیکن اسے Doctrine اور Dogma کی اینٹوں اور گارے سے مرئی شکل دی گئی۔ یہ 'ظاہرہ' بڑی زوردار اور موثر تھی۔ بنی آدم کے جسد میں یہ 'ظاہرہ' اس کی حیات (Life) اور حیویت (Vitality) کو ہلاک کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ چنانچہ یہی 'ظاہرہ' روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے 'رسالت' کے اجرا کا باعث ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم پر رحم فرمایا اور 'مذہب' کے مہلکۃ کے انسداد کے لئے اپنی رحمت خاص سے زمین پر 'رسالت' کا اجرا فرمایا۔ اس طرح روئے ارض پر انسانی معاشرے میں انبیا اور رسل کی بعثت کا آغاز ہوا۔

۹۔ روئے ارض پر نسل آدم وسیع تر علاقوں میں پھیلنے لگی۔ اس کی تعداد اور زمین پر موجود 'متاع' سے استفادہ کے امکانات میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بنی آدم کے لئے دو 'ظاہرات' کا ظہور ہوا۔ یہ دو ظاہرات (Phenomena) تھیں:

۱۔ اختیار (Authority) —— اور

۲۔ دولت (Wealth)۔

ہزاروں سال کی انسانی تاریخ میں یہ دونوں ظاہرات (Phenomena) تین صورتوں میں بے قابو ہو کر پھوٹ پڑیں:

۱۔ اضطرابی ظاہرہ (Pinching Phenomenon)

۲۔ ظالمانہ ظاہرہ (Tyrannical Phenomenon)

۳۔ بے رحم ظالمانہ ظاہرہ (Ruthless Tyrannical Phenomenon)

انسانی تاریخ میں متبدل رنگوں (Shades) طرزوں (Forms) اور فکروں (Ideologies) کے ساتھ یہ کسی بھی نام سے معروف رہیں، ہوئیں یا کی گئی ہوں ـــــ مثلاً عصر حاضر میں ـــــ شدت پسندی، دہشت گردی، آمریت، ملوکیت، اشتراکیت، اشتمالیت، سرمایہ داری، استعماریت، اکثریتی آمریت، حتیٰ کہ اباحیت، الحاد اور انکار خدا ـــــ ان کی نوعیت ہمیشہ مذکورہ تین صورتوں کی رہی۔ ان میں سے ہر ایک انسانی معاشرے میں کبھی دوستانہ مسابقت دہندہ (Friendly Competitor) رہی، کبھی ظالمانہ مسابقت دہندہ (Tyrannical Competitor) اور کبھی بے رحم ظالمانہ مسابقت دہندہ (Ruthless Tyrannical Competitor)۔ لیکن ان دونوں ظاہرات یعنی اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) کے تینوں انفجارات (Spillovers) روئے ارض پر بنی آدم کے وجود (Existence) اور مقصد وجود (Raison d'etre) کے لئے مہلک بالعین (Really Fatal) کبھی نہیں ہوئے۔ اگر کوئی 'ظاہرہ' بنی آدم کے وجود (Existence) اور مقصد وجود (Raison d'etre) کے لئے مہلک بالعین بنی تو صرف 'مذہب' بنا۔ اس لئے کہ بنی آدم کو وجود اور مقصد وجود کے اعتبار سے ہلاک کرنے کی استعداد اور آمادگی صرف 'مذہب' میں پائی جاتی تھی۔ قرآن نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

یٰبنی آدم لا یفتننکم الشیطٰن ـــــ اولیاء للذین لا یؤمنون (الاعراف ۲۷)

ترجمہ: اے اولاد آدم کی! نہ بہکائے تم کو شیطان ـــــ رفیق ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے۔

اس تاریخی پیش رفت کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے روئے ارض میں موجود تین عوامل

۱۔ بنی آدم

۲۔ مستقر اور

۳۔ متاع

میں اپنی ایک ایسی 'سنت' جاری فرمائی ہے جو ان دونوں ظاہرات (Phenomena) کے بے قابو (Out of Control) ہوتے ہی خود بہ خود (Suo natura, Suo jure et Suo motu) متحرک ہو جاتی ہے اور روئے ارض پر Normalcy کو یقینی بنا دیتی ہے۔ اس 'سنت اللہ' کے ایک پہلو کا ذکر قرآن نے یوں فرمایا ہے:

ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض (البقرہ ۲۵۱)

ترجمہ: اور اگر نہ ہوتا دفع کرادینا اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتی زمین۔

اسی 'سنت اللہ' کے تحت روئے ارض پر ہمہ دم 'متبدل قوتیں' (Changing Forces) اور انسانی حیات اور اس کے ماحول میں موثر متبدل عوامل (Effective Variable Factors) باہم متعامل (Interact) ہوکر ان کا سد باب کردیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی 'ظاہرہ' روئے ارض پر بنی آدم کی حیات اور اس کے مقصد وجود کے لئے مہلکۃ نہیں بن پاتی۔

اس کے برخلاف 'مذہب' (Religion) اور اس کے علمبردار 'علما' (Ulama) بنی آدم کی حیات (Life) اور اس کے مقصد وجود (Raison d'etre) کے لئے ہمیشہ مہلک بالعین (Really Fatal) بن کر سامنے آئے۔ روئے ارض پر انسانی معاشرے میں حالات کی اس تبدیلی اور انحطاط کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

"اتخذو ا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ و المسیح ابن مریم "(التوبۃ ۳۱)

ترجمہ: ٹھہرالیا (یہود نے) اپنے علما اور رہبان کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور ٹھہرالیا (نصاریٰ نے) مسیح ابن مریم کو خدا اللہ کو چھوڑ کر۔

۱۰۔ 'مذہب' اور 'علما' کا 'فساد' ناقابلِ اصلاح ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بنی آدم کی صالح قوتیں اس مہلکۃ کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں۔ جاری 'سنت اللہ' کے جوارح اور طرق بھی اسے معتاد طریقے سے روکنے پر قادر نہیں ہوتے۔ (بات یہ نہیں ہے کہ 'سنت اللہ' انھیں معتاد طریقے سے روکنے پر قادر نہیں۔ وہ انھیں روک سکتی ہے لیکن وہ ایسا کرتی نہیں۔ اس لئے کہ معتاد طریقے سے 'علما' اور مذہب کے فساد کو روکنے میں بنی آدم کی جان اور زیست کے متاع کو ناقابل برداشت زیاں کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے)۔ چنانچہ یہی وہ مہلکۃ بالعین ہے جس کے سد باب کے لئے 'ربانی مداخلت' بالآخر ناگزیر ہو جاتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ روئے ارض پر انسانی معاشرے میں انبیا اور رسل کی بعثت فرماتا ہے۔ انسانی تاریخ کی یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انبیا و رسل صرف 'مذہب' اور اس کے علمبردار 'علما' کے انسداد اور ان کے قلع قمع کے لئے ہی مبعوث ہوئے۔ اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) کے انفجار کے انسداد کے لئے اختیار اور دولت کے حاملین اور امیدواران اختیار و دولت کے درمیان ہمہ دم جاری کشمکش ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اختیار اور سرمایہ یا مال دونوں 'دولت' اسی وجہ سے کہلاتے ہیں کہ ان کے اندر جاری 'سنت اللہ' انھیں یکساں ثابت اور قائم رہنے نہیں دیتی۔ قرآن نے فرمایا:

و تلك الایام نداولھا بین الناس (آل عمران ۱۴۰)

ترجمہ: اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔

لیکن 'مذہب' اور 'علما' کا معاملہ جداگانہ اور منفرد ہے۔ 'مذہب' اور اس کے علمبردار 'علما' اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) دونوں کو اپنے اختیارِ عظمٰی (Super Authority) کے تحت Monopolise کر کے انھیں 'آلہ' Instrument بنا لیتے ہیں۔ یہ ارتکاز 'مذہب' اور 'علما' کو ناقابل تسخیر (Impregnable) بنا دیتا ہے۔ وہ لامحدود (Transcendental) ہو جاتے ہیں۔ ان کے حدود بیک وقت حقیقی (Actual) اور تعبیری (Virtual) دونوں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب 'علما' اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) دونوں کو مذہب کے اختیارِ عظمٰی (Super Authority) کے زیر سایہ Monopolise اور Consolidate کرنے میں صد فی صد کامیاب ہو جاتے ہیں تب ان کے زیر تسلط انسانی حیات روحانی اعتبار سے 'شیطانی' (Satanic) اور جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے 'بہیمی' (Bestial) بن کر رہ جاتی ہے۔

۱۱۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ دریں حالات اصلاحِ حال کی صرف ایک ممکنہ راہ نظر آتی ہے۔ 'اصلاح حال کے لئے خارجی مدد' کو بروئے کار لانا۔ یہ وقت کسی ایسے اقدام کے لئے موزوں ترین ہے۔ ہر چند کہ امت 'جاں کنی' میں مبتلا ہے اور اصلاحِ حال کی موثر داخلی قوت 'معدوم محض' ہے لیکن بایں ہمہ اصلاح حال کے لئے یہ گھڑی 'فیصلہ کن' اور 'نہایت موافق' (Extremely Favourable) ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں:

۱۔ سببِ اول: گزشتہ ساٹھ سالوں میں ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے نسبتاً جتنے 'اچھے' (Pliable) اور 'موافق' (Favourable) حالات رہے ہیں پوری دنیا بشمول مسلم ممالک میں اتنے اچھے اور موافق حالات کہیں میسر نہیں رہے۔ یہاں ریاست (State) دستوری (Constitutional) ہے۔ ریاست کے تینوں شعبے عدلیہ (Judiciary)، مقننہ (Legislature) اور انتظامیہ (Executive) پر جوش طریقے (Vibrantly) سے متحرک (Active) ہیں۔ ریاست فلاح نہاد (Welfare-Based) ہے۔ حکومت (Government) لبرل (Liberal)، جمہوری (Democratic) اور وفاقی (Federal) ہے۔ جب سے ملک میں دستوری حکومت قائم ہوئی ہے دستور کبھی معطل نہیں ہوا۔ اور سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ عوام کی اکثریت (Majority) کا لبرل (Liberal) اور توافق پسند (Accomodative) ہونا وقتی اور نمائشی 'ظاہرہ' نہیں بلکہ ہندوستانی

طبع (Indian Temperament) کا تاریخی حصہ ہے۔ جس ملک میں اتنے سارے موافق وجوہ جمع ہو جائیں وہاں کے حالات صرف 'اچھے' (Pliable) اور 'موافق' (Favourable) ہی کہے جا سکتے ہیں۔

۲۔ سبب دوم: مغرب تیزی سے بدل رہا ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے نزدیک مغرب زوال آمادہ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے قویٰ مضمحل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغرب اب بھی ذہنی اور فکری اعتبار سے زکی و بکر (Pure & Virgin) ہے۔ اس نے بڑی جد و جہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد گزشتہ پانچ سو سالوں میں یہ ذہنی اور فکری زکاوت و بکارت (Purity & Virginity) حاصل کی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عاجز کے علم کی حد تک وہاں کے اذہان اسلام حقیقی کے لئے صدفی صد زکی و بکر (Pure &Virgin)، تحملی (Concieving) اور تقبلی (Receptive) ہیں۔ یہ صورت حال اسلام حقیقی اور پوری انسانیت کے لئے نعمت غیر مترقبہ اور نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ عاجز کے علم کی حد تک مغرب آج 'فیصلہ کن' موڑ پر کھڑا ہے۔ لیکن افسوس! یہی وہ گھڑی ہے جب ایک خطرناک 'ظاہرہ' سر ابھار رہی ہے جو در حقیقت 'بے حد تشویشناک' ہے۔

عالمِ اسلام سے جوق در جوق بلکہ فوج در فوج 'علما' اسی مزمن اور امراض 'مذہب اسلام'، اس کے علوم، اس کی اجتماعیات اور اس کے اداروں کو لے کر وہاں پہنچ رہے ہیں۔ بڑی تعداد میں وہی مذہبی رسومات، عصبیتیں، جذبات، آداب اور ثقافت وہاں مستحکم کرتے جا رہے ہیں جو گزشتہ کئی صدیوں سے عالم اسلام کا خاصہ رہی ہیں۔ مغرب کے ان اذہان کو جو فی الوقت بالکل زکی و بکر (Pure & Virgin) ہیں انھیں ان 'علما' کے ذریعہ جس اسلام کا 'لقا' (Exposure) مل رہا ہے وہ اسلام 'دین اللہ' نہیں بلکہ وہی فاسد 'مذہب' ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لقا (Exposure) پوری انسانیت کے لئے عن قریب 'المیہ' (Tragedy) میں تبدیل ہو جائے۔ چنانچہ اگر اسی وقت ہندوستان میں اصلاحِ حال کا عمل فی الفور جاری نہیں کیا گیا تو پھر شاید اس کا جاری ہونا کبھی ممکن نہ ہو۔ اس زریں موقع کو کھو دینا ساری انسانیت کو آئندہ 'المیے' سے دو چار کر دینا ہوگا۔

تجویز: اوّل

سرسید تحریک کا جامع اور مکمل احیا

۱۔ امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال میں اصلاحِ حال کی سب سے اکمل صورت 'سرسید تحریک کے جامع اور مکمل احیا' میں ممکن نظر آتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مسلم یونیورسٹی کو 'اسوہ' (Role Model) بنانے کی ضرورت ہے۔ اسوہ سے مراد ہے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ذریعہ اس کردار کی ادائیگی جس میں یونیورسٹی بطور Pioneer، Laboratory، Incubator، Culturer، Cultivator، Raisor، Pilot، Regulator اور Ideologist اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔

۲۔ 'سرسید تحریک کے جامع اور مکمل احیا' کا پہلا اور فی الحال واحد نصب العین ہو:

''وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم'' وضع اور اس کا عملی تجربہ کرنا'' —— اس نصب العین کے تحت درج ذیل کام کئے جائیں:

۱۔ 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' کی خلاقانہ طور پر (Innovatively) تشکیل کی جائے۔

۲۔ 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' کے نصاب بنانے کی خلاقانہ طور پر سعی کی جائے۔ یہ نصاب نرسری، کنڈرگارٹن، پرائمری، مڈل، سکنڈری، کالج اور یونیورسٹی ہر سطح کا احاطہ کرتا ہو۔

۳۔ اس نقطۂ نظر سے تیار کردہ عبوری نصاب کو مدنظر رکھ کر پہلے مرحلے میں نرسری تا یونیورسٹی سطح تک ضروری —— تعلیمی، تعلمی، تدریسی، تدریبی، تحقیقی اور انتظامی امور، ان کے ادارہ جات، ان کی ہئیت

حاکمہ، ان کے آداب، مدت کار، ان کے ضوابط اور قوانین کی خلاقانہ تشکیل کی جائے۔

۴۔ اس نصاب کو ابتداء عبوری اور تجرباتی طور پر پرائمری تا یونیورسٹی سطح تک نافذ العمل بنایا جائے۔ تیس سالوں میں دس دس سالوں کے تین عرصوں (Segments) میں ان پر نظر ثانی اور ضروری ترمیم کی جائے۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس وقت موجود فیکلٹیوں اور شعبوں کو کلی یا جزوی صورت میں بتدریج افقی یا بعض صورتوں میں عمودی طور پر تحلیل کر کے ان کی خلاقانہ طور پر تشکیل کی جائے۔

۶۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود بعض فیکلٹیوں اور ان کے تحت موجود شعبوں کا مثلاً فیکلٹی آف تھیالوجی (شعبۂ دینیات) اور فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کی موجودہ صورتحال کو یکسر ختم کر کے نئے اصولوں، میقات، نصاب اور ترجیح کے ساتھ عبوری طور پر نظم جدید کیا جائے تا وقتیکہ اصل خاکے کے مطابق 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' تیار ہو کر نافذ العمل نہ ہو جائے۔

۷۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں تجرباتی طور اور Seminal اور Prenatal خاکے کے ساتھ ایک فیکلٹی قائم کی جائے جس کا نام ہو — فیکلٹی آف قرآن — اس فیکلٹی کی Seminal اور Prenatal خاکے کی مدت تیس سے پچاس سال کی ہو جو دس یا پندرہ پندرہ سال کے تین عرصوں (Segments) پر مشتمل ہوں۔ اس 'فیکلٹی آف قرآن' کے قیام سے قطعاً یہ مراد نہ ہو کہ مروج و معروف علوم قرآن مثلاً علوم قرآن کے معروف اصناف کی وہاں الگ الگ شعبوں میں تعلیم، تدریس اور تحقیق ہو۔ بعض مروج و معروف علوم القرآن جن کی کوئی اصل نہیں اور جو مصنوعی، جعلی اور محض گمراہ کن ہیں مثلاً تفسیر و علوم تفسیر کا بڑا حصہ، اسباب النزول، شان نزول، ناسخ و منسوخ، قراءت اور تجوید وغیرہ ان کی تعلیم تاریخ کے تحت تو کی جا سکتی ہے تاکہ محققین واقف رہیں کہ ماضی میں کیا کچھ ہوتا رہا تھا لیکن ان کا کوئی الگ شعبہ نہ ہو۔ فیکلٹی آف قرآن کے تحت بالکل نئے شعبے قائم کئے جائیں جن کی نئی سعت (Extent) اور ان کے نئے ابعاد (Dimensions) ہوں۔

۸۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں Seminal اور Pre-natal طور پر قائم 'فیکلٹی آف قرآن' کا اگلا ہدف ہو — حقیقی 'یونیورسٹی آف قرآن' کا قیام۔ 'فیکلٹی آف قرآن' کے پچاس تا سو سال کے تجربے کے بعد اور اس تجربے کے نتیجے میں سو سال سے دو سو سال کی مدت میں 'یونیورسٹی آف قرآن' کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ آج کی تمام یونیورسٹیاں سو تا دو سو سال بعد ختم کر دی جائیں یا از خود رفتہ رفتہ ختم ہو کر رہ

جائیں۔ سو سے دو سو سالوں میں روئے ارض پر جو نظام تعلیم اور ادنیٰ سے اعلیٰ ترین تعلیم گاہ ہو وہ دراصل 'یونیورسٹی آف قرآن' کا حصہ ہو۔ یہ 'یونیورسٹی آف قرآن' سرتاپا 'یونیورسٹی آف ھدیٰ' ہو۔ ھدیٰ سے مراد ہے اللہ کی 'وحی اور رسالت' پر مبنی نظام تعلیم۔ چنانچہ خواہ اس 'یونیورسٹی آف ھدیٰ' کے تحت کوئی بھی شعبہ مثلاً Faculty of Astro-Physics یا Faculty of Nebular-Physics ہی کیوں نہ قائم ہو وہ 'ھدیٰ' کی روشنی میں ہو۔ کسی کو یہ غلط فہمی رخوش فہمی نہ ہو کہ وہ آج کی معروف اسلامی رعالمانہ یونیورسٹی جیسی کوئی یونیورسٹی ہوگی۔ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس یونیورسٹی کے نظامِ علم میں آج کے معروف 'علما' اور ماہرین سائنس دونوں 'جاہل محض' قرار پاکر 'بےکار' ہو جائیں۔ مثلاً اس یونیورسٹی کی کسی فیکلٹی کے کسی شعبے میں اذا الشمس کورت (التکویر۔۱) میں 'إذا' کو Calculate کرنے کی بات آئے تو ماہرین سائنس فین مین (Feynman: 1918-1988)، آئن سٹائن (Einstein: 1879-1955)، برٹرینڈ رسل (Bertrend Russel: 1872-1970)، بوھر (Bohr: 1885-1962) اور فرمی (Fermi: 1901-1954) بے بس نظر آئیں کہ ان کے علوم اسے Calculate کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) یہ کہیں کہ کائنات میں جاری صرف ایک طبیعی قانون کے تحت تو وہ Calculate کر سکتے ہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ درست بھی ہو؟

۹۔ نرسری، کنڈرگارٹن، پرائمری، مڈل اور سکینڈری اسکولوں کے جملہ امور کی اس 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کے مطابق خلاقانہ تشکیل کی جائے۔ نو تا بارہ سال کی عمر تک سکنڈری تعلیم سے فراغت ہو جائے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ عاجز جن الفاظ کا استعمال کر رہا ہے مثلاً نرسری، مڈل، سکنڈری وہ صرف ابلاغ کے لئے ہیں ورنہ خود ان الفاظ، ان کی تقسیم اور درجہ بندی اور ان کے وہ مفاہیم جو آج ان سے لئے جاتے ہیں ان کی عاجز کے نزدیک از روئے حقیقت کوئی اہمیت نہیں۔ ان کا استعمال صرف ابلاغ کے لئے کیا جا رہا ہے۔

۱۰۔ بعض امور کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ کچھ عبوری اور Diversional اقدام کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مثلاً اگر ضروری محسوس ہو تو ابتدائی پچاس سے سو سال کے لئے ایک عبوری نظم کا اجرا کیا جا سکتا ہے تاوقتیکہ 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' پوری طرح زیر عمل (Functional) آجائے۔ اس عبوری اور Diversional اقدام کے تحت مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 'مدارس' (Seminaries) کا ایک نظم قائم کیا جائے۔ یہ مدارس مسلمانوں میں رائج مدارس کی طرح قطعاً نہ ہوں

خواہ وہ جامعہ از ہر کا طرز ہو یا دار العلوم، دیو بند یا ندوۃ العلماء، لکھنؤ یا جامعہ ام القریٰ کا طرز بلکہ یہ لازماً 1500 عیسوی سے قائم آکسفرڈ اور کیمبرج کے Seminaries یا جرمن Hochschule کے طرز پر قائم ہوں۔ اس خاکے کی اسلامی توجیہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ واضح ہو کہ 'یونیورسٹی آف قرآن' کے قائم ہو جانے پر اس کی سکینڈری اور پری یونیورسٹی درجات کو چھوڑ کر بقیہ تمام درجات یا تمام درجات ختم کر دیئے جائیں۔

۱۱۔ سر سید تحریک کے مکمل احیا اور 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کی کوششوں کو پوری طرح (Optimally) ثمر آور (Productive) بنانے کے لئے سب سے پہلے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اپنی موجودہ 'جان کنی' کی حالت سے باہر نکل آئے اور اس کی صحت کم از کم Stabilize ہو جائے۔ اس Clinical تدبیر کی نوعیت دراصل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے جسم میں جان بچانے والی ادویہ (Life Saving Medication) پہنچانے اور ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ہے تا کہ وہ ان مہلک اور مضر صحت عوامل کو فوری طور پر بے اثر (Neutralize) کر سکے جو یونیورسٹی کو سرعت کے ساتھ موت کی آغوش میں لے جا رہے ہیں۔ اس حوالے سے فی الفور دو اقدام کئے جائیں:

۱۔ مدارس کے Recognition اور Affiliation کا خاتمہ:

ابتدا سے انتہا تک، ہر سطح اور ہر شعبے سے، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے 'مدارس' (بلا تفریق تمام مدارس خواہ وہ درسِ نظامی والے مدارس ہوں یا دیگر نصاب کے مدارس) سے کلّی انقطاع (Total Disconnection & Disengagement) کو یقینی بنایا جائے۔ چنانچہ تمام 'مدارس' جن کا وہاں کسی بھی اعتبار سے بالواسطہ یا بلا واسطہ Affiliation یا Recognition ہے اسے فی الفور علی الاطلاق اور بلا استثنا کالعدم قرار دے دیا جائے۔ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ علانیہ، خفیہ، بلا واسطہ یا بالواسطہ 'مدارس' سے فارغ کوئی بھی طالبِ علم یا استاد پرائمری سطح سے D.Litt تک کسی سطح میں یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکے۔

۲۔ ذمہ دارانِ مدارس کو آگاہی:

اس حتمی اقدام کے ساتھ ساتھ اس بات کی شدید اور فی الفور ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ذمہ داران 'مدارس' کے ذمہ داران کو آگاہ کریں کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا مدارس کے تعلق سے یہ اقدام قطعاً معاندانہ (Hostile)، تفریقی (Discriminatory)، فرقہ وارانہ (Communal)،

طبقاتی (Sectional)، مسلکی (Sectarian) اور جارحانہ (Aggressive) نہیں ہے۔ یہ اقدام سراسر طبی (Pathological)، منطقی (Logical) اور معقول (Rational) ہے۔ اس کا واحد مقصد ایک مکمل 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' وضع کرنے کی کوشش کو یقینی بنانا اور جلد از جلد اس کے ہدف کو پورا کرنا ہے۔

انھیں رضا کارانہ، خیر خواہانہ اور بلا طلب یہ مشورہ بھی دیا جا سکتا ہے بلکہ دیا جانا چاہیے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اپنے طور پر اور اپنی صوابدید سے 'مدارس' میں اسی طرح ابتدا سے انتہا تک ایک 'جامع مکمل اسلامی نظامِ تعلیم' جسے وہ اپنے طور پر احسن اور انسب سمجھتے ہوں وضع کرنے کی کوشش کریں۔ انھیں اس سے بھی آگاہ کیا جائے کہ ہم اس حوالے سے جامع 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' وضع کرنے کے لئے 'خارجی مدد' کے بطور حکومت ہند سے درخواست کرنے اور ان کا تعاون لینے جا رہے ہیں اگر وہ بھی مناسب سمجھیں تو اس طرح کے اقدام اپنے طور پر کر سکتے ہیں۔

۱۲۔ اس مقام پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

ا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے 'مدارس' کے حوالے سے اس نوعیت کے اقدام کی جو بظاہر سخت (Drastic) اور دوررس (Far-reaching) معلوم ہوتے ہیں کیا ضرورت ہے؟

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا یہ اقدام کس طرح طبی (Pathological)، منطقی (Logical) اور معقول (Rational) ہے؟

۱۳۔ ان دونوں سوالوں کے پیش نظر چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس تدبیر کا براہ راست تعلق —— اسلام دین اللہ، نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور امت مسلمہ کی نفسیات، مقصد وجود اور فرائض منصبی سے ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابو امامہ الباہلی روایت فرماتے ہیں:

عن أبي امامه الباهلي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لينقضن عرا الاسلام عروة عروة فكانما انتقضت عروة تشبث الناس بالتي تليها و اولهن الحكم و آخرهن الصلاة. (مسند احمد. ج. ٥ مرويات ابو امامه الباهلي)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دی گئی اس خبر اور اس میں بیان کردہ نکات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ا۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں زوال آئے گا۔

۲۔ یہ زوال دائرِی ہوگا۔

۳۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں آنے والا زوال اوپر سے آئے گا۔

۴۔ امتِ مسلمہ محمد یہ کا زوال اصلاً 'قیادت کا زوال' ہوگا۔

۵۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں آئے زوال کے سبب منشعب (Ramified) اور متضارب (Multiplied) ہوکر پھیلنے والے فسادات کا منبع اصلاً 'قیادت' ہوگی۔

۶۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں بالآخر 'اصلاح' آئے گی۔

۷۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں 'اصلاح' 'دین اللہ کے ظہور' پر منتج ہوگی۔

۸۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں 'اصلاح' اوپر سے آئے گی۔

۹۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں 'اصلاح' 'قیادت کی اصلاح' ہوگی۔

۱۰۔ امتِ مسلمہ محمد یہ میں اس آخری 'اصلاح' کے سبب منشعب (Ramified) اور متضارب (Multiplied) ہوکر پھیلنے والی 'صالحات' کا منبع بھی 'قیادت' ہی ہوگی۔

چنانچہ یہی 'حقیقتِ مہدیٔ' ہے۔

سحرم دولتِ بیدار بہ بالیں آمد گفت بر خیز کہ آن خسروِ شیریں آمد

۱۴۔ برسبیلِ تذکرہ یہاں ایک بات کا ذکر تقریبِ فہم کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حالیہ زمانے میں متعدد براعظموں میں چلنے والی بدعنوانی مخالف تحریکات قابلِ غور ہیں۔ عاجز نہیں جانتا کہ ان تحریکات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ کتنی مخلصانہ ہیں؟ ان کے اصلی محرکات کیا ہیں؟ ان کے سرپرست، اعوان وانصار کون ہیں؟ تاہم ان تحریکات کا ایک پہلو قابلِ غور ضرور ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ان تحریکوں کا اصل زور 'اوپر کی اصلاح' پر ہے اور اس کا اصل رخ 'اوپر سے اصلاح' کی جانب ہے۔

یہ بات بے حد غیر معمولی، چونکانے والی اور حیران کُن ہے۔ یہ تحریکات درست بھی ہوسکتی ہیں اور متنبیانہ بھی۔ ممکن ہے یہ کسی 'وَارِدَہ' کا حصہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس لاہوتی 'إلقاء' کا جو فی زمانہ خَلا ومَلاے ارضی پر عارض ہے محض 'انعطافی انجذاب' اور 'تَلَقّی' کا نتیجہ ہوں۔ بہر حال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زمانہ تیزی سے اس جانب رواں ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

۱۵۔ جہاں تک امت میں 'اصلاح' کی روایت ہے تو اس کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ مثلاً گزشتہ تین سو سالوں میں 'رائج، تسلیم شدہ اور معروف اصلاح' کی اکثر کوششیں قرآن وسنت کی روشنی میں خدا مخالف (Anti-Allah)، رسول مخالف (Anti-Rasulullah) اور سنت مخالف (Anti-Sunnah) رہی ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ان تمام 'رائج، تسلیم شدہ اور معروف اصلاحی کاوشوں' کے روح رواں اور اعضاو جوارح 'علما' ہی رہے ہیں۔ ان تمام 'علما۔ نہاد اصلاحی کوششوں' کی حقیقت، ان کی صورت، ان کی ترجیحات، ان کا رخ اور ان کا زور۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سے متصادم اور ان کے منشا کے خلاف رہے۔

ان 'علما۔ نہاد اصلاحی' کاوشوں کے درمیان متفق علیہ اور مشترک امور درج ذیل ہیں:

۱۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں مفاسد کا 'ظرف اور مظروف' مسلم عوام ہیں۔

۲۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں مفاسد کے انسداد کے سامان صرف 'علما' کے پاس ہیں۔

۳۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں مفاسد کے انسداد کی اہلیت اور صلاحیت صرف 'علما' کے اندر ہے۔

۴۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں مفاسد کے انسداد کا اختیار (Authority) صرف 'علما' کے پاس ہے۔

۵۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں مفاسد کے انسداد کی صرف وہی کاوش معتبر ہے جو 'علما' کی جانب سے ہو۔

۶۔ چنانچہ امت مسلمہ محمدیہ میں اصلاح کا مفہوم صرف اور صرف 'علما کے ذریعہ عوام کی اصلاح' ہے۔

یہی سبب ہے کہ 'علما۔ نہاد اصلاحی تحریکات' کے صدفی صد رخ (Orientation)، جہت (Direction)، مواد (Content)، زور (Stress) اور ترجیح (Priority) لے دے کر 'عوامی اصلاح' سے متعلق اور صرف اس پر مبنی ہوتے رہے ہیں۔

'علما' کا —— یہ 'موقف' اور ان کا یہ 'موقف' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اور ان کی بدترین مخالفت ہیں۔ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بدترین مخالفت اس لئے ہے کہ یہ 'ربیائی یہودیت' کی روح، مزاج اور تعامل کی مثالی ترجمانی ہے جو کسی رسول اور اس کی ہدایت کی سخت دشمن ہے۔ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق امت مسلمہ محمدیہ کی ساری خرابیوں کا منبع اور مُحرِک خواص (Elite) ہوا کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھرپور وضاحت فرمائی تھی۔ چنانچہ صحابۂ رسول بخوبی جانتے تھے کہ خواص (Elite) کون ہوں گے۔ چنانچہ ایک روایت ہے:

وعن زیاد ابن حدیر قال: قال لی عمر: هل تعرف ما یهدم الاسلام؟ قلت: لا۔ قال: یهدمه زلة العالم و جدال المنافق بالکتاب و حکم الائمة المضلین (رواه الدارمی)

ترجمہ: حضرت زیاد بن حدیر فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمر نے دریافت کیا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسلام کو کون سی چیز منہدم کر دے گی؟ میں نے کہا: مجھے نہیں معلوم۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: عالم کی ہوس، منافق کا کتاب اللہ کے بارے میں جھگڑا کرنا (اللہ کی کتاب کو تباہ کر دینا) اور گمراہ حکمرانوں کی حکمرانی۔

661 عیسوی سے وقوع پذیر حقیقی اسلامی تاریخ کا اعتبار کیا جائے تو یہی تین عوامل تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ تین عوامل ہیں:

۱۔علما

۲۔منافق اور

۳۔حکمراں

ان میں اول و دوم دراصل ایک ہی صنف کے دو شاخسانہ ہیں جو 661 کے بعد ایک ہو گئے۔ دوسری طرف 661 عیسوی کے بعد تیسرا عامل یعنی حکمراں صرف مجازاً اور تعبیراً باقی رہا ورنہ حقیقۃً اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ حضرت ابوامامہ الباہلی کی روایت کے مطابق ''نقض صلاۃ'' کے بعد حکمراں اسلامی معاشرے کے حقیقی میدانِ عمل سے خارج ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں خواص (Elite) میں صرف 'علما' شمار کیے جا سکتے ہیں۔

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق پہلی صدی ہجری کے بعد امت مسلمہ محمدیہ میں مفاسد کا 'ظرف اور مظروف' صرف اور صرف وہ ہوں گے جو 'علما' کے نام سے موسوم و معروف ہوں گے۔ اب ایسی صورت میں ان 'علما' کا 'اصلاح' کے حوالے سے تمام مفاسد کا 'ظرف اور مظروف' عوام کو قرار دینا خدا مخالف، رسول مخالف اور سنت مخالف عمل کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خبر جس میں آپ نے فرمایا:

وعن علی قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یوشك ان یاتی علی الناس زمانٌ لا یبقی من الإسلام إلاّ اسمه ولا یبقیٰ من القرآن إلاّ رسمه. مساجد هم عامرةٌ

وھی خرابٌ من الھدیٰ. علماءھم شر من تحت اِدِیمِ السماء. من عندھم تخرج الفتنۃ وفیھم تعود (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان)

ترجمہ: حضرت علی روایت کرتے ہیں: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: قریب ہے کہ لوگوں پر ایسا دور آئے گا:

۱۔ جب اسلام نام کے لئے باقی رہ جائے گا،

۲۔ اور قرآن کی لکھاوٹ (یا لکھاوٹ کا نشان) باقی رہ جائے گی،

۳۔ مسجدیں آباد ہوں گی،

۴۔ مگر ھدیٰ کا کھنڈر ہوں گی،

۵۔ اس کے علما آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے،

۶۔ ان (علما) سے فتنے ظاہر ہوں گے،

۷۔ اور وہ (فتنے) انھیں پر لوٹیں گے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اسلام مٹ جائے گا، قرآن کی یاد باقی رہ جائے گی، مسجدیں آباد مگر ھدایت سے خالی ہوں گی۔ علما بدترین مخلوق ہوں گے۔ وہ تمام فتنوں کے Habitat ہوں گے۔ امت کے جسد میں وہ ایک نامیہ Organism کی طرح ہوں گے جس کی غذا امت مسلمہ محمدیہ کی حرارت غریزی ہوگی۔ اور ان تمام مصیبتوں کو صرف 'عوام' کو جھیلنا ہوگا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا: أن یاتی علی الناس زمانٌ عام مسلمانوں پر آ پڑنے والی کیسی ہولناک مصیبت کی خبر دیتی ہے۔

۱۶۔ اس 'ظاہرہ' کے حوالے سے بیسویں صدی میں برپا ہونے والے چند مخصوص اور اہم حوادث اور صورتحال کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں دو غیر معمولی تحریکوں نے جنم لیا۔ یہ دو غیر معمولی تحریکیں تھیں:

۱۔ تبلیغی جماعت جس کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی تھے ——— اور دوسری ———

۲۔ جماعت اسلامی جس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔

یہ دونوں تحریکیں عظیم الشان تھیں لیکن ان کے بانیین اپنی زندگی میں اپنے اپنے اہداف کو پانے میں ناکام ہوگئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں تحریکوں کے مضمرات وعواقب امت مسلمہ کے لئے بے حد سنگین ہوئے۔ دونوں ہی تحریکیں اپنے بانیین کی وفات کے بعد اسلام اور امت مسلمہ کے لئے

Counterproductive ہو گئیں۔

۱۷۔تبلیغی جماعت اور مولانا محمد الیاس:

مولانا محمد الیاس اور ان کی برپا کردہ تحریک 'تبلیغی جماعت' (قیام 1927) کا دقیق مطالعہ اور تجزیہ سب سے پہلے ان کی سہ گانہ اہداف کو واضح کرتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ مولانا محمد الیاس کے نزدیک ان کی تحریک کے تین اہداف تھے:

۱۔انسدادِ فساد اور خاتمہ ٔمنبع فساد

۲۔اصلاحِ خواص یا اصلاحِ قیادت

۳۔تربیت و تزکیۂ عوام

بیسویں صدی کی تیسری دہائی 1927 سے 1944 تک جب مولانا محمد الیاس نے وفات پائی اور 1944 سے تادمِ تحریر 2012 تک 'تبلیغی جماعت' کی کاوشوں کا دقیق جائزہ یہ بتاتا ہے کہ اس جماعت نے بلاشبہ اپنے ہدفِ اول کے نصفِ اول کے حصول میں غیر معمولی اور حیران کن کامیابی حاصل کر لی۔مولانا الیاس کے مطابق (ایسا لگتا ہے کہ) امتِ مسلمہ میں فساد کا منبع اصلاً 'علما' ہیں۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ بانیٔ تحریک نے تبلیغی جماعت اور اس میں شامل عوام کو 'جارحہ' بنایا اور اس 'جارحہ' کا سہارا لے کر اولاً منبع فساد یعنی 'علما' کا زور توڑ دینا چاہا۔تمام امور کا جائزہ بتاتا ہے کہ وہ اس کے نصفِ اول یعنی 'علما بالقوۃ' کو توڑ دینے میں بآسانی کامیاب ہو گئے۔مولانا الیاس کی تبلیغی جماعت نے عملاً مسلم معاشرے میں 'علما' کو قوۃً (Potentially) بے اثر (Neutralise) کر کے مجبور و بےبس کر دیا۔مسلم معاشرے میں 'علما' کی یہ بےبسی پچھلے پچاس سالوں کے دوران برصغیر میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ہندوستان کے طول و عرض میں تبلیغی جماعت کے سامنے 'علما' اسی طرح بےبس ہو کر رہ گئے جس طرح الف لیلیٰ و لیلۃ کی کہانی سند باد جہازی کے 'سفرِ وادی گوہر' میں پرندہ 'رخ' کے آ جانے پر بڑے بڑے سانپ بےبس ہو جایا کرتے تھے۔لیکن مولانا محمد الیاس اور ان کی تبلیغی جماعت ابھی تک 'علما' کو 'بالفعل' بےبس کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جہاں تک دوسرے اور تیسرے اہداف کی بات ہے تو مولانا محمد الیاس اور ان کی تبلیغی جماعت ان دونوں اہداف کے حصول میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اصلاحِ خواص یا اصلاحِ قیادت اور تربیت و تزکیۂ عوام میں نہ صرف وہ ناکام ہو گئے بلکہ اسلامی حیویت (Islamic Vitality) کے نقطۂ نظر سے

مولانا محمد الیاس کی تبلیغی جماعت امتِ مسلمہ کے لئے حد درجہ Counter productive ثابت ہوئی۔ یہ بحث نہایت الجھی ہوئی ہے جس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(الف) تبلیغی جماعت کے تین اہداف میں سے ڈھائی اہداف میں ناکامی کا بنیادی سبب 'علما' کا تاریخی تعامل ہے۔

مولانا محمد الیاس کے زیر قیادت تبلیغی جماعت جیسے جیسے متحرک اور فعال تر ہوتی گئی 'علما' بالخصوص 'بڑے علما' خاموش اور Encapsulated ہوتے چلے گئے۔ ان کی خاموشی اور ان کا Cocooned ہونا ہی ان کی طرف سے سلبی (Passive) اور منفی (Negative) جوابی حملہ (Couterattack) تھا۔ چنانچہ 'علمائے اجل' نے عافیت کدوں میں سمٹ جانے میں مصلحت یا عافیت سمجھی اور متوسط اور چھوٹے علما نے مولانا محمد الیاس کی 'تبلیغی جماعت' کا حصہ بن جانے میں۔ لہذا یہ انوکھا Polarization عالمِ واقعہ میں ایک واضح تبدیلی ضرور لے کر آیا۔ مسلم معاشرے میں 'علما' کی Oligarchy تبلیغی جماعت یا کاندھلہ کی Monarchy میں بدل کر رہ گئی۔ لیکن اس تبدیلی نے 'علما' کو صرف 'بالقوۃ' بے بس کر دیا۔ وہ اب بھی 'بالفعل' موجود رہے۔

(ب) تبلیغی جماعت نے عوام کو 'جارحہ' (Membrum or Minister) کے بطور نہایت کامیابی سے بر سرِ عمل کیا۔ اس کے نہایت Complex بلکہ Multiplex نتائج برآمد ہوئے۔ تبلیغی جماعت کے ذریعہ عوام کے Multiple Exposure نے مسلم عوام کو جو اب 'تبلیغی' کہلاتے یا کہلانا پسند کرتے تھے نامیہ (Vector) میں تبدیل کر دیا جس نے تبلیغی جماعت کے اندر اور باہر مسلم معاشرے میں پائی جانے والی ہر شئے ـــــ افراد، اجتماعیات اور اداروں اور ان کے اذہان، دماغ، شعار، فکر، عادت اور تعامل کو مکمل طور پر عامی (Vulgar) بنا کر رکھ دیا۔ عامیانہ پن (Vulgarity) کا یہ جرثومہ (Virus) اور اس کا یوں نامیہ (Vector) میں تبدیل ہو جانا علمائے عمرانیات (Sociologists) کے لئے حیرتناک تھا۔

تبلیغی جماعت میں پیدا شدہ Vectorization اپنے جلو میں عجیب و غریب 'ظاہرے' لے کر آیا۔ 'تبلیغی جماعت' کے زیر اثر آنے والے مسلم معاشرے کے خواص دیکھتے دیکھتے ذہنی اور علمی طور پر 'عوام' میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف تبلیغی جماعت میں سرگرم عوام آناً فاناً 'خواص' بن گئے۔ سرگرم تبلیغی عوام کا 'خواص' بن جانا دراصل ان کا 'علما' بن جانا تھا۔ بلاشبہ تبلیغی جماعت کے اثر، اقتدار اور وسعت نے عوام کو بالفعل نہیں تو بالقوۃ 'علما' ضرور بنا دیا۔

(ج) ملک کے ہر خطے اور حصے میں تبلیغی جماعت کے پھیل جانے سے معاشرے پر اس کی گرفت مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ قصبہ قصبہ، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں تبلیغی جماعت کے ذمہ داران کی رائے اب معنی رکھتی تھی۔ چنانچہ اس صورتحال نے امت میں پانچ کیفیات کو جنم دے دیا:

۱۔ 'علمائے اجل' کی رجعت اور عقب نشینی (Retirement, Retreat & Retrogression)

۲۔ 'علمائے متوسط و عام' کی تبلیغی جماعت میں پناہ گزینی (Emigration to the Refugium)

۳۔ تبلیغی جماعت سے متاثر 'خواص' کی 'عامیت' (Plebeianization & Vulgarization)

۴۔ تبلیغی سرگرم عوام کی 'خاصیت' (Patricianization)

۵۔ بقیہ مسلم افراد و طبقات (خواہ ان میں اعلیٰ ترین اہل علم اور عباقرہ ہی کیوں نہ ہوں) کا مکمل Marginalization۔

ان پانچوں کیفیات نے دو نتائج برآمد کئے:

۱۔ تبلیغی جماعت اپنے دوسرے ہدف یعنی اصلاحِ خواص یا اصلاحِ قیادت میں کلیۃً ناکام ہوگئی۔

۲۔ تبلیغی جماعت اپنے تیسرے ہدف یعنی تربیت و تزکیۂ عوام میں کلیۃً ناکام ہوگئی۔

لیکن یہ دونوں ناکامیاں بالکل الگ اور متخالف ہیں۔ ان میں وہی بُعد ہے جو 180° کے دوسروں کے مابین ہوتا ہے۔ تبلیغی جماعت اپنے دوسرے ہدف میں اس لئے ناکام ہوگئی کہ اس عنوان سے اس نے کوئی کام سرے سے کیا ہی نہیں۔ اور جو کیا وہ Counter productive تھا۔

اپنے تیسرے ہدف میں تبلیغی جماعت اس لئے ناکام ہوگئی کہ اس نے عوام کو 'جارحہ' بنا دیا۔ عوام کے علی الاطلاق 'جارحہ' بننے نے اسے فوراً نامیہ (Vector) میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ان نامیوں (Vectoris) کا Spill شروع ہوگیا جو اب لامتناہی نظر آتا ہے اور بظاہر بے قابو (Uncontrollable) بھی۔

(د) تبلیغی جماعت کا ایک مخصوص اثر برصغیر میں ایسا بھی ہوا ہے جس کا باضابطہ کوئی سروے اب تک نہیں کیا جاسکا ہے یا کوئی ایسا سروے عاجز کے علم میں نہیں آسکا ہے۔ لیکن Random Samples اور ان کے Data کی بنیاد پر ایسا کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اثرات امت مسلمہ پر بڑے مہلک ہوئے ہوں گے۔ ہندوستان میں پچھلی صدیوں میں خانقاہوں (مزارات نہیں) بالخصوص علمی خانقاہوں نے نہایت اہم رول ادا کیا تھا۔ ہندوستان میں ان کی تشکیل ایک خاص توجیہ (Orientation) رکھتی تھی جس کو

ہندوستانی مزاج سے خاص مناسبت تھی چنانچہ کم از کم گاؤں کی سطح پر (اور ہندوستان چونکہ روایۃً دیہی ملک رہا ہے) ان خانقاہوں نے نہایت مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا تھا۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان کے طول وعرض میں قائم لاکھوں خانقاہیں جو اب مزارات یا درگاہوں کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور ان سے وابستہ پیر صاحبان اور پیرزادگان اسلام کے نمائندے ہیں۔ بلاشبہ صوفیائے کرام نے ہندوستان میں اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ لیکن ان کے بعد اور ان کے نام سے قائم ان کی خانقاہوں اور ان سے وابستگی ظاہر کرنے والوں نے اسلام کی ایسی بیخ کنی کی جو تاریخ میں یاد رکھی جائے گی۔ عاجز نے 'خانقاہ' لکھ کر یہاں ایک خاص مفہوم لیا ہے۔ لہٰذا اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ خانقاہ کے دو معانی اور دو صورتیں ہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں صدیوں سے ان دونوں معانی اور صورتوں کی خانقاہیں پائی جاتی رہی ہیں۔ ان میں ایک اسلامی ہے جب کے دوسرے کا اسلام سے صرف برائے نام تعلق ہے۔

۲۔ خانقاہ کی پہلی قسم: شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مطابق یہ لفظ خان بمعنی خانہ اور قاہ بمعنی دعا سے مرکب ہے یعنی عبادت خانہ۔ [ملاحظہ فرمائیں: خیر المجالس]۔ خانقاہ کسی 'محل' یا 'مقام' کی طرح وجود رکھتے ہوئے بھی کوئی تعمیر نہیں ہوتی تھی۔ ہر وہ 'محل' یا 'مقام' جہاں ایک ہستی اور چار چیزیں پائی جائیں اسے خانقاہ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ ایک ایسے تعبیری مقام (Virtual Place) کو کہتے ہیں جو چند دنوں، مہینوں یا سالوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ وہ پانچ ذوات جو کسی 'محل' کو خانقاہ بناتی ہیں درج ذیل ہیں:

۱۔ شیخ، ۲۔ سجادہ، ۳۔ خرقہ، ۴۔ دستار اور ۵۔ نعلین۔ چنانچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر سے آخری ملاقات میں فرمایا:

''من امانت شمارا یعنی سجادہ وخرقہ ودستار ونعلین بقاضی حمیدالدین ناگوری خواہم داد بعد از پنجم روز بشما خواہد رسانید آنرا گرو آرید، مقام مامقام شما است''۔ [ملاحظہ فرمائیں: امیر خورد: سیر الاولیا۔ ص ۴۳]

ایسی خانقاہ شیخ کی حیات تک باقی رہتی تھی پھر یا تو وہاں منتقل ہو جاتی تھی جہاں مذکورہ پانچ ذوات ہوں یا پھر ختم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی سے ان کے مقرب خاص شیخ زین الدین نے دریافت کیا:

''مخدوم بیشتری مریدان شما صاحب حال واہل کمال اند۔ از یں جملہ یکی را اشارت شود کہ بجای شما نشستہ باشد کہ ایں سلسلہ بکلی گسستہ نگردد''۔ حضرت نے فرمایا کہ جن درویشوں کو تم اہل سمجھتے ہو ان کے نام

لکھ لاؤ۔شیخ زین الدین نے تین فہرستیں تیار کیں۔اعلیٰ،اوسط اور ادنیٰ۔شیخ نے مطالعہ کے بعد فرمایا:

''شیخ زین الدین ایشاں را بگو کہ غم ایمان خود بخورند چہ جای آن کہ بار دیگر بردارند''۔

[ملاحظہ فرمائیں:تکملہ خیر المجالس اور سیر العارفین]

چنانچہ حضرت چراغ دہلوی نے وصیت فرمائی کہ سلسلہ کے سب تبرکات ان کے ساتھ دفن کردیئے جائیں۔

ایسی خانقاہوں میں شیخ کی زندگی میں چار اقسام کے لوگوں کی آمدورفت اور قیام رہتا تھا۔

۱۔خلفا، ۲۔مخصوص مریدین، ۳۔عام مریدین اور، ۴۔عوام۔شیخ کی وفات پر یہ تعبیری خانقاہ (Virtual Khanqah) ختم ہوجاتی ہے۔

۲۔خانقاہ کی دوسری قسم: شیخ کی وفات کے بعد بھی وہ جگہیں حسب سابق خانقاہیں کہلاتی ہیں۔ لیکن اب وہ شیوخ کے مزارات اور ان کی صلبی وصہری اولادوں کی سکونت گاہ بن جاتی ہیں۔حکمرانوں، امرا، منتسبین،متمول مسلمانوں اور دیگر عقیدت مندوں کے ہدایا،نذرانوں اور تحائف سے یہ مقامات اور اس کے ساکنان فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ہر چند کہ ایسی جگہیں اب بھی خانقاہیں کہلاتی ہیں اور ان کے متعلقین بالواسطہ یا بلاواسطہ،ضرورۃً یا مصلحتہً پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں لیکن ان کا ان بزرگانِ دین سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔بالخصوص حضرات چشتیہ کے تین بنیادی اصول تھے۔جن سے خانقاہوں کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے:

۱۔اصول اول برائے خانقاہ: طمع منع،منع منع اور جمع منع

۲۔اصول دوم برائے منتسبین: مرکزی نظام سے وابستگی

۳۔اصول برائے خلفاء،مریدین خاص،مریدین: تارک دنیا ہونا۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے خلافت نامہ دیتے ہوئے فرمایا:

''می باید کہ تارک دنیا باشی۔ بسوی دنیا و ارباب دنیا مائل نشوی و دیہہ قبول نکنی۔ وصلہ بادشاہاں نگیری''۔[ملاحظہ فرمائیں: سیر الاولیاء،ص۔۲۹۵]

'تارک دنیا' کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت محبوب الٰہی نے مزید فرمایا:

۱۔فتوح کو جمع کر کے نہ رکھیں۔

۲۔امراو سلاطین کی صحبت سے پرہیز کریں۔

۳۔ وظائف اور ادرار قبول نہ کریں۔

۴۔ ملازمت شاہی سے بچیں۔ [تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: سیر الاولیاء، فوائد الفواد، احسن الاقوال، انفاس العارفین وغیرہ]۔

چنانچہ پہلی قسم کی خانقاہیں اب خال خال ہیں۔ رہیں دوسری قسم کی خانقاہیں تو ان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

تبلیغی جماعت نے ان خال خال بچی اصلی خانقاہوں پر نہایت منفی اثرات ڈالے۔ عوامی اور عمومی خانقاہوں اور مزارات پر خواہ کوئی اثر نہ پڑا ہو لیکن علمی خانقاہیں تباہ و برباد ہو گئیں یا ٹھٹھر کر رہ گئیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

[C.W. Troll, (ed): Muslim Shrines in India: Their Character, History and Significance: Oxford: OUP. 1989]

(ہ) ان تمام باتوں کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسلم معاشرے کی ھیئتِ ترکیبی میں ایسا انقلاب آیا جو شاید چنگیز، ہلاکو اور نادر شاہ کے حملوں سے بھی مسلم معاشرے میں نہ آسکا تھا۔ کسی بھی قوم کے جسد کے تین افقی حصے ہوتے ہیں۔ یوں تو سب اہم ہیں لیکن سب سے اہم متوسط حصہ ہوتا ہے جو جسم میں کمر کی مانند ہے۔ مسلم معاشرے کا متوسط طبقہ اس کی کمر کے مانند تھا۔ تبلیغی جماعت نے مسلم معاشرے کے ھیکل کو Upside down کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ امت کی کمر ہی ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس کا اندازہ اگلے پچاس سالوں میں بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آخر ایسا ہوا کیوں؟ ان تمام باتوں کی جڑ کہاں ہے؟ تبلیغی جماعت کی کارکردگی کا غائر مطالعہ اور تجزیہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کا سبب خود اس تحریک کی تعمیر میں ایک مضمر خرابی تھا۔ تعمیر میں وہ مضمر خرابی تھی: ''اس تحریک کے بانی مبانی اور ان کے تمام اجل رفقا کا خود طبقۂ علما سے ہونا۔'' چنانچہ اس تحریک کے تمام عُمَدْ (Pillars) 'مدارس' کے فارغین تھے۔ ان کی فکر اور ان کا فکری افق، علم اور علمی عمق، عمل اور عملی میدان، ذہن اور ذہنی سعت، پسند اور ناپسند اور ان کے سارے اوزان و عیارات 'مدرسہ' کے ماحول میں تشکیل پائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہر چند کہ انہوں نے تین اہداف مقرر فرمائے لیکن ان کے لاشعور میں صرف تیسرا ہدف حاوی تھا۔ چنانچہ ان کا سارا زور تیسرے ہدف پر رہا۔ لیکن چونکہ وہ شعور کی سطح پر تین اہداف رکھتے تھے چنانچہ ان کے شعور نے تیسرے 'معمول' کو 'معمول' رہنے نہیں دیا بلکہ 'معمول' کو 'عامل' اور 'جارحہ' بنا دینا چاہا۔

اس شعوری اور لاشعوری تصادم کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کا 'معمول' 'عامل' بنتے ہی نامیہ (Vector) میں تبدیل ہو گیا۔ ممکن ہے ایسا نہ ہوا ہو بلکہ باطن کوئی ایسی تبدیلی واقع ہو گئی ہو جس نے ان کے تیسرے ہدف کو جن پر وہ 1927 سے عامل تھے غیر شعوری طور پر توسیع دے دی۔ 1938 کے بعد تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کی بدلتی ہوئی صورتحال کا گہرا مطالعہ یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ ایسا ہونا دراصل اس فرق اور اس کے تبلیغی جماعت پر پڑنے والے اثرات کے سبب بھی ہو سکتا ہے جو مولانا محمد الیاس اور مولانا محمد زکریا کے مزاج میں پایا جاتا تھا۔ کسی بھی تحریک میں دو مفکر (Ideologue) اور دو تفکیریں (Ideologies) مہلک (Fatal) ہوتے ہیں۔

از حد الجھی اور عسیر الاستخراج اس بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ا۔ تبلیغی جماعت ایک جمی — اجماعی — اجتماعی تحریک ہے۔ جو ہے وہ نظر نہیں آتا، جو نظر آتا ہے وہ ہے نہیں۔ یہ تحریک اب ناقابلِ اصلاح اور بے قابو ہو چکی ہے۔ ابتداءً یہ تحریک طالعی اور طلاعی تھی۔ 1938 کے بعد متفجر ہو کر بے قابو ہو گئی۔ کسی بھی عمل کی صلاح کے لئے احتساب ضروری ہے۔ اجتماعی عمل کے لئے ناگزیر۔ کسی اجتماعی عمل کا سب سے اچھا احتساب انسانی معاشرہ کرتا ہے۔ معاشرتی احتساب سے گریز، بے پروائی اور اس سے توحش خودکشی کے مترادف ہے۔ ایسی تحریک جبلی طور پر معاشرے سے لاتعلق رہتی ہے اس لئے معاشرتی احتساب کی اس کے نظام میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ 1938 کے انفجار کے بعد تبلیغی جماعت کے بے قابو ہونے کا کھلا ثبوت اس کا معاشرے کے تعلق سے اپنے 'منفرد رویئے' کا اظہار ہے۔ یہ رویہ روئے ارض کے تاریخی 'منفرد رویوں' میں سے ایک ہے۔ معاشرے کے تعلق سے اس تحریک کا رویہ ہے:

With you; Without you; and In spite of you.

چنانچہ احتساب کے بغیر کوئی تحریک 'رحمِ مفاسد' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۲۔ 1938 کے بعد اس تحریک کا عالمی ہو جانا ترقی نہیں بلکہ اس کا Fallout ہے۔ مولانا الیاس کی تحریکی سرحدیں اصلی (Actual) تھیں اب اس کی سرحدیں تعبیری (Virtual) ہیں۔ یوں تو ہر تحریک اپنے بانی کے ساتھ اختتام کو پہنچ جاتی ہے چنانچہ اس تحریک کی یافت و نایافت کی تعیین کا سن 1944 ہے۔ ایسی متعدد شہادتیں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ 1938 سے 1944 کی مدت میں اس تحریک میں وہ ساری علامتیں ظاہر ہو چکی تھیں جو کسی تحریک کی 'تعمیر' کا اعلان کرتی ہیں۔

۳۔مولانا الیاس کی تحریک کی اعلیٰ ترین خصوصیات (Forte) ہی اس تحریک کی بدترین کمزوریاں (Bête noires) تھیں۔مولانا الیاس کی تحریک دوخصوصیات کی حامل تھی اولاً: زبانی (Oral) اور ثانیاً: سادہ (Simplistic)۔کہا جاتا ہے کہ یہ مولانا الیاس کی تدبیر تھی۔عاجز کا خیال ہے کہ ایسا نہیں تھا بلکہ اپنی تحریک کو زبانی (Oral) اور سادہ (Simplistic) بنانا یا رکھنا ان کی مجبوری تھی۔ایسی مجبوری دو دھاری تلوار کے مانند ہوتی ہے جو اکثر اوقات خودکشی (Suicide) پر منتج ہوتی ہے۔چنانچہ یہی مجبوری 1938 کے بعد Suicidal ہوگئی۔

۴۔تبلیغی جماعت پر پچھلے ساٹھ سالوں میں جو کچھ تحقیق ہوئی وہ 'ناقص' اور 'گمراہ کن' ہے۔اس کا ایک ہی سبب ہے: ساری تحقیقات 'ظواہر' سے بحث کرتی ہیں۔کوئی بھی قابل ذکر تحقیق اس کی 'حقیقت' سے بحث نہیں کرتی۔اس کا سبب قابلِ فہم ہے۔محققین ایسی 'اہلیت' اور ایسے 'ادوات' کے حامل نہیں جو اس طرح کے Ultramundane تحرک کا ادراک کرسکیں۔

توراۃ اور انجیل کے ان مباحث کی جو قرآن میں اپنی اصلی حالت میں مخزون ہیں گہرائیوں تک رسائی کے بغیر ایسی تحریک کو سمجھنا ممکن نہیں۔لِمَ تؤذوننی (61:5)، نحن انصار الله (61:14) اور لِمَ تقولون مالا تفعلون (61:2) تک آج کس کی رسائی ہے؟

۵۔عاجز کا خیال ہے کہ مولانا الیاس اس تحریک کا آغاز کرتے ہوئے ایک بات فراموش کرگئے۔وہ یہ بھول گئے کہ ان کا وجود 'آدمی'، 'انسانی' اور 'بشری' ہے۔لہٰذا وہ 'باہمہ' ہوسکتے ہیں اور نہ 'بے ہمہ' رہ سکتے ہیں۔چنانچہ 'باہمہ' کو اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ دوسروں کو اپنا 'علم' منتقل کرے یا دوسروں پر اپنا 'ارادہ' ظاہر کرے۔اسی طرح 'بے ہمہ' کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی کو اپنا 'نصب العین' بتائے۔چنانچہ مولانا الیاس اپنی تحریک کے 'بانی' اور 'ہادم' دونوں ثابت ہوئے۔1944 کے بعد کے Phenomenon کی دو اعتبار سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

اولاً: اگر اسے مولانا الیاس کی وہی تحریک مانا جائے جو 1927 میں قائم ہوئی تھی تو پھر 1944-2012 کی مدت میں واقع ہونے والے امور وظواہر اس تحریک کے Fallout قرار پائیں گے۔

ثانیاً: اگر 1944 کو مولانا الیاس کی تحریک کا سالِ انہدام مانا جائے تو اس مدت 1944:2012 میں مرادف تحریکیں ان حضرات کی تحریکیں قرار پائیں گی جو اس کے 'امیر' رہے یا ہیں۔

۶۔عاجز کے نزدیک مولانا الیاس کا سب سے دقیق اظہار اس گفتگو میں امت کے سامنے آیا جو

انھوں نے اپنے مرض الموت میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے کی۔[ملاحظہ فرمائیں: رسالہ الفرقان ماہ رجب وشعبان ۱۳۶۳ھ]

۷۔عاجز کے نزدیک 'تبلیغی جماعت' آفاق میں پھیل کر رہے گی۔کوئی اس کی راہ باندھ نہیں پائے گا۔اس لئے کہ وہ سب کچھ ہوکر رہے گا جس کی خبر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔سرسید: آثار الصنادید۔ج۔دوم،مرتب خلیق انجم،اردو اکیڈمی،دہلی۔

۲۔مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی: تذکرہ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ،جلد اول ودوم، دار الاشاعت کاندھلہ،مظفر نگر۔

۳۔محمد عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید،مکتبہ شیخ زکریا،سہارنپور۔

۴۔مولانا محمد منظور نعمانی: ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس،الفرقان بک ڈپو،لکھنؤ۔

۵۔چھ باتیں۔

۶۔مولانا محمد زکریا: تبلیغی نصاب (اب فضائل اعمال)۔

۷۔مولانا محمد زکریا: آپ بیتی: مکتبہ شیخ زکریا،سہارنپور۔

۸۔مولانا محمد زکریا: الاعتدال فی مراتب الرجال۔

۱۸۔جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت اور جماعت اسلامی کے لٹریچر اور تاریخ کے دقیق مطالعے اور تجزیے سے ان کے اہداف یوں مشخص ہوتے ہیں:

۱۔حکومت الٰہیہ کا قیام: یہ وہ ہدف ہے جسے بعد میں 'اقامتِ دین' سے تعبیر کیا گیا۔

۲۔اس ہدف کے حصول کے لئے ایک 'صالح جماعت' کی تشکیل۔

جماعت اسلامی کے قیام کی بذری مدت (Seminal Period) کا اعتبار کیا جائے تو دس سالوں بعد اور اگر اس کے باضابطہ قیام کی تاریخ کا اعتبار کیا جائے تو محض تین سالوں بعد اس تحریک کے بانی مبانی مولانا مودودی کو بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کی تحریک انجامِ کار کے اعتبار سے مقصد گاہ تک پہنچنے سے قاصر رہے گی جس کا برملا انھوں نے اظہار بھی کر دیا تھا۔[ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی، حصہ دوم و سوم] تاہم وہ ایک باعزم انسان تھے۔لہٰذا کسی بھی باہمت اور دیانتدار جہاز راں کی طرح جس پر اتھاہ

سمندر کے بیچ یہ بات منکشف ہو جائے کہ اب یہ جہاز جس کا وہ کپتان ہے منزل تک نہیں جا سکتا اور انخلا کی کوئی صورت بھی میسر نہیں انہوں نے اپنی تحریک کے جہاز کو ترک (Abort) نہیں کیا۔ محض تین سالوں کے اندر ہی انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان سے ذاتی طور پر دو 'غلط فہمیاں' سرزد ہو چکیں ہیں جن کے سبب وہ دو خلاف واقعیت اندازے (Estimates) قائم کر چکے ہیں جن کی توجیہ مکرر اب ممکن نہیں۔ وہ دو 'غلط فہمیاں' درج ذیل ہیں:

۱۔ علما سے ربط

۲۔ ہدف کے حصول میں عجلت

مذکورہ دو باتوں کے انکشاف کے باوجود عاجز کا اندازہ ہے کہ مولانا پر یہ بات کماحقہٗ واضح نہیں تھی کہ یہ دونوں 'غلط فہمیاں' فی الواقع ان سے کیسے سرزد ہوئیں؟ عاجز کا خیال ہے کہ ان کا تعلق مولانا کی زندگی میں واقع ہونے والے اس المیئے سے ہے جس سے وہ بچپن اور لڑکپن میں گزرے۔ وہ بلاشبہ ذہین، طباع اور فطین تھے۔ ایسے میں ناموافق حالات نے انھیں غیر معمولی طور پر اُحذ بنا دیا۔ چنانچہ حد درجہ ذہین اور فطین انسان ایسے ناموافق حالات میں ایک ایسے Reductionism کا احساس کرنے لگتا ہے جو اصلی ہونے کی بجائے Pseudo-Reductionism سے مشابہ ہوتا ہے۔ ماحول میں اگر تعمیری قوتیں حاوی ہوں تو ذہین اور فطین انسان اس Pseudo-Reductionism کے نقص کا جلد ادراک کر لیتا ہے اور اسے درست کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر بدقسمتی سے ماحول غیر تعمیری، تخریبی یا جدالی ہو تو فطین انسان بھی یا تو ادراک نہیں کر پاتا یا اگر کرتا بھی ہے تو اس کی درستگی کرنے کی حالت میں خود کو نہیں پاتا۔

چونکہ زمانے کو ثبات نہیں۔ وہ ہمہ دم متبدل اور متغیر ہے۔ لہٰذا اس کا جبر انسان کو ہمہ دم بروقت فیصلے کرنے کے لئے مجبور کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک یہی وہ وقت ہوتا ہے جب انسان سے ایسی 'غلط فہمیاں' سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔ عاجز کا اندازہ ہے کہ ایسا ہی مولانا مودودی کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔ ان کے اندر پیدا ہونے والے Reductionism کے دو نتائج برآمد ہوئے:

۱۔ سطحی معلومات

۲۔ عجلت پسندی

کسی کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ 'سطحی معلومات' سے مراد یہاں 'مجرد سطحی معلومات' ہے۔ ذہین، طباع اور فطین انسان کی 'سطحی معلومات' بھی دس کتابی کیڑوں (Nerds) سے زیادہ وسیع و عمیق ہوتی ہے۔

’علما‘ کے تعلق سے مولانا محمد الیاس اور تبلیغی جماعت کا رویہ ’تدبیری‘ معلوم ہوتا ہے جسے برتنے کے لئے مولانا محمد الیاس نے عوام کی نہایت اچھی تربیت کی تھی اور ان سے بھرپور کام لیا۔ 1950 سے قبل تبلیغی جماعت میں رائج درج ذیل 'Clitches' اسی ’تدبیری‘ رویہ کا اظہار معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ ’علما‘ کی تکریم کی جائے۔

۲۔ ’علما‘ کی دعائیں لی جائیں۔

۳۔ ’علما‘ (تبلیغ سے) زیادہ اہم اور اعلیٰ وارفع کاموں میں مشغول ہیں۔

۴۔ ’علما‘ کو (تبلیغ میں) شمولیت کی دعوت دی جائے لیکن ان کے عدمِ شرکت پر قطعاً ان سے یا ان کے حوالے سے اظہارِ ناراضگی نہ کی جائے۔

مولانا محمد الیاس اس پر سختی سے عامل رہے اس باب کا نقطۂ عروج وہ موقع ہے جب آپ نے اپنے میواتی مسترشدین کو مولانا تھانوی (1863-1943) کے پاس ان کی خانقاہ میں پیش فرمایا۔

اس کے برخلاف ’علما‘ کے تعلق سے مولانا مودودی کا رویہ ہمسرانہ مگر مصالحانہ، مفاہمانہ اور عاجز کی رائے میں خوش فہمانہ تھا۔ مولانا مودودی کا یہ رویہ ان کی تحریک کے لئے اوّل وہلہ میں ہی مہلک (Fatal) ثابت ہوا۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ محمد منظور احمد نعمانی: مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف: الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ۔

۲۔ حکیم خواجہ اقبال احمد: میں بھی حاضر تھا وہاں: 1986۔

۳۔ میاں طفیل محمد: مشاہدات۔

ایسا لگتا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ رویہ بنیادی طور پر ان کے Reductionism کے سبب پیدا ہوا تھا۔

دوسری جانب ایسا لگتا ہے کہ مولانا مودودی اپنے ’ہدفِ اصلی‘ کے دونوں اجزا کے حوالے سے بھی اسی Reductionism کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہدف اور اس کی حصولیابی کے لئے عمرانی علوم (Social Sciences) کے مختصرات سے استفادہ کیا جس کے سبب عاجز کی ناقص رائے میں اس کے قیام کے Segments یا Phases کے تعلق سے وہ درست، عملی اور حقیقت پسندانہ فیصلے نہ کر سکے اور انتشارِ ذہنی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ عاجز کی ناقص رائے ہے کہ اگر مولانا مودودی نے عمرانی علوم (Social

(Sciences) کی مبسوطات اور مطوّلات کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کے دقیق نکات کی Simulation بھی کر لی ہوتی تو ان سے یہ غلط فہمی ہرگز ہرگز سرزد نہ ہوتی۔ ممکن ہے دوسری بات ہو۔ بعض اوقات ایسی غلط فہمی کا ارتکاب 'طبع' اور 'مزاج' کی 'مخصوص افتادٗ کے سبب بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ مولانا مودودی کی پہلی غلط فہمی ان کی دوسری غلط فہمی کا سبب بنی ہو بلکہ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ قرائن بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کی پہلی غلط فہمی خود ایک خاص نقطۂ نظر کا نتیجہ تھی۔ مولانا مودودی 'علما' کو لاشعوری طور پر معیارِ حق، معیارِ اسلام اور معیارِ مطلوب سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس ایسے وزنی دلائل اور محکم ثبوت ہیں کہ 'علما' ان کے ہم خیال ہو جائیں گے۔ ان کو اس کا یقین تھا کہ وہ 'علما' کو مطمئن کر لیں گے۔ قرآن و احادیث کا ان کا وسیع مطالعہ انھیں یقین دلا رہا تھا کہ ان کی دعوت پر 'علما' کا بڑا طبقہ ان کی آواز پر لبیک کہہ دے گا۔ اسی خیال نے غالباً ان کی تحریر کو لاشعوری طور پر 'علما' موجّہ (Ulama Oriented) بنا دیا۔ ہمہ وقت 'علما موجّہ' ہونے کی کیفیت نے انہیں لاشعوری طور پر 'علما' کی طرح سوچنے والا بنا دیا۔ 'علما' نے تو انہیں پہلے ہی طعن تشنیع سے وضع وقطع میں 'قبلہ نما' بنا دیا تھا۔ تحریک کے قیام کے پہلے سال سے ہی وہ اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر 'علما' کی تحدی (Threat) کی زد پر رہے۔ اندرونی اور بیرونی 'علما' کے نشانے کی زد پر ان کی زندگی 'علما نہاد' (Ulama-Typed) بن کر رہ گئی چنانچہ ایسی حالت میں وہ قرآن و سنت کا Simulation کرنا تو دور کی بات قرآن و سنت میں جمہور سے الگ ہٹ کر غور کرنے کی جراءت بھی کیسے کر سکتے تھے لہٰذا وہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور 'دہر' کے مابین درست تطبیق کرنے سے قاصر رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گہرائیوں تک وہ صرف 'علما' کے سبب پہنچنے سے قاصر رہے۔ کاش انہوں نے 'علما' کا خیال پہلے سے ہی اپنے ذہن سے نکال دیا ہوتا اور یک سو ہو کر صرف عصری علوم کے حاملین، تعلیم گاہوں اور زندگی کے ان شعبوں کو اپنا میدانِ کار بنایا ہوتا جہاں صرف عصری علوم کے افراد کی نمائندگی ہوتی تھی تو آج معاشرہ ان کی تحریک کے لئے غیر معمولی امکانات کا نقشہ پیش کر رہا ہوتا۔

تقریب فہم کے لئے ایک مثال دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دو افراد جن میں ایک پاؤں سے معذور ہے اور دوسرا اندھا اور دونوں کو ایک پہاڑی سلسلہ پار کرنا ہے جہاں پتلی پگڈنڈیاں، گھماؤ دار راستے اور دونوں جانب گہری وادیاں ہیں۔ ان دونوں کے پاس صرف ایک ہی راہ ہے کہ اندھا پاؤں

سے معذور شخص کو اپنے کاندھوں پر سوار کرلے اور پاؤں سے معذور مگر بینا شخص اسے راہ بتاتا جائے۔ اب اگر اندھا اسے اپنے کاندھے پر سوار کرانے کو راضی نہ ہوتو پاؤں سے معذور شخص پہاڑی سلسلہ عبور کرسکتا ہے ممکن ہے کہ اس کی ایک دن کی راہ ایک ہفتے میں طے ہو۔لیکن اگر اندھا اس پر بضد ہو کہ وہ پاؤں سے معذور شخص کو کاندھوں پر سوار کرائے نہ اس کی بتائی راہ پر چلے بلکہ وہ خود پاؤں سے معذور شخص کے کاندھوں پر سوار ہونا چاہے اور اس راہ پر چلنا چاہے جس کی راہنمائی وہ خود کرے تو دونوں ہلاک ہوکر رہ جائیں گے۔ مولانا مودودی نے بالواسطہ اور لاشعوری طور پر 'علما' کی اسی ضد کے سامنے خود سپردگی کردی جس نے مولانا کو وادیٔ تیہ میں پہنچا کر دم لیا۔

مولانا مودودی کو اپنی تحریک کے 'ہدفِ اصلی' کے Segments یا Phases کی تعیین میں سخت تسامح ہوا جس کا سبب قرآن واحادیث میں غور وفکر کرنے میں 'جمہور علما' کا نقطۂ نظر اختیار کرنا تھا۔ 'جمہور علما' کا فہمِ قرآن واحادیث عملی زندگی سے کوسوں دور ہے بلکہ عملی زندگی سے اس کا کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا، لہٰذا ایسا تسامح ہونا خلافِ توقع نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کے اس ہولناک مگر دقیق نکتے کو مولانا محمد اسلم جیراجپوری نے کس حسن وخوبی سے بیان فرمایا ہے:

''مسلمانوں میں جب سے لامرکزیت آئی اس وقت سے انھوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے قرآن وحدیث کو لے لیا اور اولوالامر کی جگہ علما آ گئے۔ جن کے باہمی جھگڑوں میں سے کوئی ایک جھگڑا بھی آج تک قرآن وحدیث سے فیصل نہ ہوسکا۔ یہ خیال مذہبی انفرادیت کی پیداوار ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت صرف زندہ امام کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے جو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق امت کو قرآن کی روشنی میں اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔ اور اس کی ہر قسم کی باہمی نزاعوں کا فیصلہ کرتا رہے۔ نہ حدیث رسول ہے نہ علما اولوالامر ہیں''۔ (مولانا محمد اسلم جیراج پوری: تاریخ امت: حصہ ہشتم: اسلام اور قرآن: صفحہ ۱۴۔ ۱۳: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1995)۔

چنانچہ مولانا مودودی نے 'جمہور علما' کے فہمِ قرآن وحدیث کو اختیار کرکے اقامتِ دین کی ابتدائی اقامت (Primary Construction)، ثانوی اقامت (Secondary Construction)، ثلثی اقامت (Tertiary Construction) اور آخری اقامت (Final Construction) کو قرآن وسنت کی حقیقی روشنی میں تطبیق کرنے کی بجائے 'جمہوری' روشنی میں تطبیق کرکے کچھ سے کچھ کردیا۔ اس امر کو ایک اور زاویۂ نظر سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کاش مولانا مودودی نے تعمیری اور تشکیلی مراحل کو

Regular کی بجائے Secular طور پر لیا ہوتا تو اس صورتحال میں عین، عین الصواب اور عین الیقین سے Deviation نہایت معمولی (Infinitesimal, Minimal or Negligible) ہوتا جو ہر حال میں Bridgeable یا قابلِ اصلاح تھا۔ تعمیری مراحل کو Secular طور پر لینے سے مراد ہے امت کے اندر Potential اور Actual استعداد پیدا کرنے کے زاویئے کا لحاظ کرنا۔ چونکہ استعداد برسرزمین حقیقی امور سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس حوالے سے Regular مواد (Facts & Data) اور فہم (Understanding & Insight) دھندھلے، منعطف اور محجوب ہیں جب کہ Secular مواد اور فہم تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، Updated اور آزمودہ ہیں لہٰذا Secular ہونے کے باوجود وہ صد فی صد مجرب ہوتے۔

ان تمام تفصیلات پر غور کرنے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ مولانا محمد الیاس اور مولانا مودودی کی تحریکوں کے ناکام بلکہ Counter productive ہو جانے کا اصل سبب عنصری فرق کے باوجود ان کا 'علمانہاد' (Ulama-Typed) ہونا تھا۔

۱۹۔ یہ دیکھ کر ازحد حیرت ہوتی ہے کہ کم و بیش ایسا ہی تسامح سرسید جیسی عبقری ہستی سے بھی ہوا۔ جب اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' وضع کرنے کی ان کی عملی کوششیں 'علما' کی مخالفت کا باعث بنیں یا انہیں ایسا لگا تو اپنے اصل خاکے سے پیچھے ہٹتے ہوئے محض 'مصالحت' کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے مولانا محمد اکبر کاندھلوی کو علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کا ذمہ دار اور پھر چند دنوں بعد باضابطہ مولانا عبداللہ (داماد مولانا قاسم نانوتوی) کو ناظم دینیات بنا دیا۔ ممکن ہے بات صرف مصالحت کی نہ ہو۔ اس لئے کہ کچھ اور بھی باتوں اور پہلوؤں کے 'سراغ' ملتے ہیں۔ ممکن ہے سرسید کو اس کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔ یا ممکن ہے سرسید نے دفع ضرر کے لئے ایسا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سرسید نے اھونُ البلیتین کا راستہ اختیار کیا ہو۔ لیکن ایسا فیصلہ بہرحال ان کے لئے ازحد مہلک ثابت ہوا۔

۲۰۔ حقیقی اسلام کے احیا اور 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' کی تشکیل میں مدارس کے فارغ 'علما' کی شمولیت اور شراکت غیر ضروری (Unnecessary) ہی نہیں بلکہ مہلک (Fatal) بھی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے مطابق 'اجنبی بنا دیئے جانے والے یا ہو جانے والے اسلام' کے پلٹ آنے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ اب ربیائی اسلام کے اس پشتارۂ علم کا جو قرآن و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علی الرغم در اصل ربیائی یہودیت (اور ربیائی نصرانیت Rabbinic Christianity) کی تشکیل جدید تھا۔۔۔ کیا کام؟ یوں بھی عصر حاضر میں ارادۂ الٰہی کے ظہور اجلال نے اسلامی فقہ کے نام سے معروف 'ربیائی یہودی

فقہ' کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ Bio-technology، Bio-Sciences، Semen Banks، Artificial Insemination، Surrogate Motherhood، Stem Cell Culture وغیرہ نے اس 'ربیائی یہودیت نہاد اسلامی فقہ' کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے ہیں۔ اب یہ 'فقہ' اور 'اصول فقہ' امتِ مسلمہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک قدم ساتھ نہیں دے سکتے۔ 'حقیقی اسلام کے احیا' اور 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' میں انھیں ساتھ رکھنا غیر ضروری (Unnecessary) ہی نہیں بلکہ مہلک (Fatal) بھی ہے۔ 'ربیائی یہودیت نہاد فقہ' لایعنی اور فضول (Redundant) ہو چکی ہے۔ عاجز کو حیرت ہے کہ بعض لوگ اب بھی اس کھنڈر کو الشاطبی (متوفی A.D. 790) کی الموافقات کی اڑواڑ لگا کر اور محمد عبدہ اور محمد رشید رضا کی تیار کردہ بلیوں اور کھپچیوں سے سہارا دے کر کھڑا رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ الشاطبی کی اڑواڑ لگانے والوں کو پہلے الشاطبی کا حال تو دریافت کر لینا چاہیے۔ وہ کون تھے؟ کیا چاہتے تھے؟ آٹھویں صدی عیسوی میں یعنی پہلی صدی ہجری کے فوراً بعد انھیں اس کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تھی کہ وہ مقاصد الشارع، مقاصد الشریعۃ اور مقاصد الشرعیۃ پر بحث فرمائیں؟

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ابو اسحاق الشاطبی: الموافقات: دار المعرفۃ: بیروت

۲۔ احمد الرئیسونی: نظریۃ المقاصد عند الإمام الشاطبی: المعهد العالمی للفکر الإسلامی: الموسسۃ الجامعیۃ: 1992

۳۔ عبد الرحمن الکیلانی: قواعد المقاصد عند الإمام الشاطبی: المعهد العالمی للفکر الاسلامی و دار الفکر: 2000

۴۔ محمد الطاهر بن العاشور: مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ، تونس: 1366ھ

۵۔ جمال الدین عطیہ: نحو تفعیل مقاصد الشریعۃ: المعهد العالمی للفکر الاسلامی: 2008

۶۔ محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصد شریعت: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی: 2009

۲۱۔ مسلم معاشرے میں پہلی صدی ہجری کے نصفِ آخر میں ہی رائج اور راسخ کردہ 'ربیائی یہودیت نہاد فقہ' کی حقیقت سے ہر زمانے میں صالحین اور حقیقی اہلِ علم واقف رہے ہیں۔ دوسروں کا ذکر چھوڑ دیجیے پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے ہی خود 'حکمرانوں' اور 'علما' نے قولاً اور عملاً اس کے 'اصل چہرے' سے

پردہ اٹھا دیا تھا۔ حکمرانوں اور علما کے ذریعہ قائم 'انتظامی ثنویت' اس کا کھلا ثبوت تھی۔ مروج قانون کا وہ 'عمودی حصہ' جس کے مصدر و مصدّ ر' حکمراں' تھے اس کا نام 'تعزیر' (آئین) رکھا گیا جب کہ دوسرا 'عمودی حصہ' جس کے مصدر و مصدّ ر 'علما' تھے اس کا نام 'شرع' رکھا گیا۔ 'تعزیر' حکمرانوں کے مفاد کا عکاس تھی اور 'شرع' ربیائی فقہ کی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں 'ماشاء اللہ' نظام اسلامی (؟) تھا۔ تفسیر، حدیث اور فقہ پر بہار (؟) آئی ہوئی تھی۔ چنانچہ آسمان نے انھیں دنوں روئے زمین پر دو نا قابل فراموش مناظر دیکھے۔ عقل حیران ہے کہ اسلام کے اس 'دورزریں' میں اللہ اور رسول کے کس حکم کی ایسی تعمیل ہو سکتی ہے؟ آسمان نے دیکھا کہ اسی نام نہاد اسلامی 'تعزیر' کے تحت جعد بن درہم کو خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق نے عیدالاضحیٰ کے دن بطور قربانی ذبح کر دیا اور چند ہی دنوں کے بعد ولید بن یزید خلیفۃ المسلمین نے خالد بن عبداللہ قسری سابق والیٔ عراق کو اس کے جانشیں والی عراق یوسف بن عمر ثقفی کے حوالے کر دیا جس نے خالد کو شکنجے میں کس کر اس کے سینے کو ریتی سے ریت ڈالا۔ ظاہر ہے اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ان میں سے کوئی بھی قانون — تعزیر ہو یا شرع — آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ ان باتوں سے ہر زمانے میں صالحین اور حقیقی اہل علم واقف تھے۔

لیکن جہاں تک عصر حاضر میں اس کی 'قلعی' کے کھل جانے کی بات ہے تو اس سے کون باخبر آج واقف نہیں؟ آج بائیوکیمسٹری (Bio-Chemistry)، بائیوٹکنالوجی (Bio-Technology)، بائیوجینیسس (Bio-Genesis)، بائیوڈائنامکس (Bio-Dynamics)، بائیوانجینئرنگ (Bio-Engineering)، بائیواتھکس (Bio-Ethics)، بائیولوجی (Biology)، بائیومیڈیسن (Bio-Medicine)، بائیوفیزکس (Bio-Physics) اور بائیوسنتھیسس (Bio-Synthesis) سے واقف افراد خوب جانتے ہیں کہ آج روئے ارض میں انسانی ماخوذات (Intakes) خواہ وہ بصورت غذا ہوں یا مشروبات یا ادویہ یا بصورت دیگر ماخوذات مثلاً Fixtures جیسے Artificial Devices یا Chips وغیرہ اب اس نام نہاد فقہ کے مطابق 50 فیصد سے 90 فیصد حرام لعینہ سے مستفاد ہیں اس اعتبار سے دنیا کے مختلف خطوں اور احوال کے مسلمانوں کے ماخوذات (Intakes) میں حرام لعینہ کا تناسب درج ذیل ہے:

۱۔ 99 فیصد حرام لعینہ : خلانوردوں کے ماخوذات

۲۔ 80-90 فیصد حرام لعینہ : مشرق وسطی میں رہنے والوں کی اکثریت کے ماخوذات

۳۔ 80-60 فیصد حرام لعینہ : یوروپ، شمالی امریکہ، جاپان اور آسٹریلیا جیسے صنعتی / مغربی ملکوں میں رہنے والوں کی اکثریت کے ماخوذات

۴۔ 60-50 فیصد حرام لعینہ : دنیا کی دیگر بیشتر مکمل شہری آبادیوں (Highly Urbanized Population) کے ماخوذات

۵۔ 50 فیصد حرام لعینہ : دنیا کی بقیہ تمام آبادی کی اکثریت کے ماخوذات

تجویز: دوم

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اصلاحِ حال براہ انتظامی تدابیر

ا۔اگر بوجوہ پہلی تجویز یعنی ''سر سید تحریک کا جامع اور مکمل احیا'' سر دست ممکن نہ ہو یا اس حوالے سے موثر تدابیر کرنے کی گنجائش فی الفور ممکن نہ ہو تو تجویز دوم پر عمل درآمد کیا جائے۔ تجویز دوم ''مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اصلاح حال براہ انتظامی تدابیر'' سے موسوم کی جاسکتی ہے۔ تجویز دوم کی مخصوص غایت اور ہدف درج ذیل ہیں:

ا۔اس تجویز کی روح 'سر سید تحریک کے جامع اور مکمل احیا' کے لئے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو زندہ، متحرک اور موثر رکھنا ہے۔ اس روح اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر یونیورسٹی میں موجود اور کچلی ہوئی صلاحیتوں کو زندہ کرنا، زندہ رکھنا اور متحرک کرنا ہے۔ لہذا 'سر سید تحریک کے جامع اور مکمل احیا' کے کام کو فی الحال ناممکن العمل یا دشوار ہونے کے سبب کم از کم دس سالوں کے لئے موخر کر کے ساری قوت اس نقطے پر مرکوز کرنی ہے تا کہ یونیورسٹی کی حیویت (Vitality) باقی رہے۔ چونکہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکے ہیں کہ 'سر سید تحریک کا جامع اور مکمل احیا' خواہ کتنا ہی پاکیزہ اور ارفع نصب العین کیوں نہ ہو اگر میدانِ کار، تجربہ گاہ اور جسدِ اولین یعنی یونیورسٹی ہی قوۃً (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) باقی نہ رہی تو پھر کیا حاصل؟ 'مسلم قیادت' کی گزشتہ سو سالوں کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اس کام کے لئے حکومت اور اس کے اعضا اور اداروں کی مدد اب ناگزیر نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بالکل ویسی ہی ہے جسے Between the Devil and the Deep Blue Sea کہتے ہیں۔

ایک جانب 'مسلم قیادت' ہے اور دوسری جانب 'نامساعد حالات'۔ عاجز کے نزدیک 'نامساعد حالات' سے گزرنا 'مسلم قیادت' پر تکیہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس کے درج ذیل اسباب ہیں:

ا۔ 'نامساعد حالات' کو ثبات نہیں۔ وہ 'متبدل ظاہرہ' ہوتے ہیں۔

۲۔ موجودہ صورتحال میں بدترین سرکار بھی 'مسلم قیادت' سے بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں:

ا۔ سرکاریں حقائق (Facts)، احصائیات (Data & Statistics)، رکارڈ (Records)، جائزے (Assessments)، ترمیمات (Amendments)، نتائج (Results)، نظر ثانی (Revision) اور منصوبہ بندی (Planning) کے تحت کام کرتی ہیں۔ سرکاریں برسرزمین حقائق پر قائم ہوتی ہیں، قائم رہتی ہیں اور برسرزمین حقائق کے ناموافق ہونے پر ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ سرکاریں برسرزمین حقائق سے اغماض تو برت سکتی ہیں لیکن بے خبر نہیں رہ سکتیں اور نہ ہی Unresponsive ہو سکتی ہیں۔

۳۔ 'مسلم قیادت' اصلاً 'عالمانہ' ہے۔ ایسی قیادت میں حقائق، احصائیات، ریکارڈ، جائزے، ترمیمات، نتائج، نظر ثانی اور منصوبہ بندی نام کی کوئی شئے پائی ہی نہیں جاتی۔ یہ قیادت برسرزمین حقائق پر قائم ہوتی ہے نہ قائم رہتی ہے اور نہ برسرزمین حقائق کے ناموافق ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔ برسرزمین حقائق سے بے خبری اس کی صفتِ اولین ہے۔

۴۔ ہندوستانی مسلمانوں پر 1858 کے بعد تین فیصلہ کن مرحلے آئے۔ یہ تینوں فیصلہ کن مرحلے ہندوستانی مسلم 'عالمانہ قیادت' کی بدتدبیریوں کے سبب ہلاکت خیز ہو گئے لیکن 'مسلم قیادت' جوں کی توں برقرار رہی۔ ان تینوں مرحلوں کے 'عموڈ' سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مرحلے میں 'مسلم قیادت' نے کس باخبری اور حساسیت کا ثبوت دیا تھا اس کا اندازہ اس عہد کی ان کی نگارشات اور تحریکات سے کیا جا سکتا ہے:

ا۔ مرحلۂ اول: 1860-1880

۲۔ مرحلۂ دوم: 1890-1919

۳۔ مرحلۂ سوم: 1930-1940

ان تینوں مرحلوں میں مسلمانوں کی 'عالمانہ قیادت' نے اسلام اور مسلمانوں کی ہلاکت کے سامان فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

۳۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس تجویز کے تحت یونیورسٹی میں اصلاحِ حال کا سارا عمل انتظامی تدابیر (Executive Measures) سے ہی کیا جانا ہے جسے حکومت ہی ممکن اور قابل عمل بنا سکتی ہے۔ اگر ہم درخواست کریں اور حکومت اس حوالے سے ہمارا تعاون کرے تو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اقلیتی دستوری حیثیت میں مداخلت کئے بغیر محض عبوری انتظامی تدابیر (Provisional Executive Measures) کے ذریعہ اصلاح ممکن ہے جس سے کم از کم اس کی حیویت (Vitality) یقینی ضرور ہو جائے گی۔

۴۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی حیویت (Vitality) کو مستحکم (Stabilize) کرنے کے لئے درج ذیل انتظامی تدابیر زیر غور آسکتی ہیں:

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے بلا تفریق، بلا استثنا اور علی الاطلاق تمام مدارس کا ہر سطح پر انقطاع۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود اساتذہ کی علمی، حقیقی اور خلاقانہ صلاحیت اور استعداد کا غیر جانبدارانہ اور شفاف امتحان مکرر (Re-examination) جس کے بعد ناکام ہو جانے والے اساتذہ کی انتظامی تدابیر کے ذریعہ اصلاحِ حال، تعزیر یا پھر مفسد عناصر (Rogue Elements) سے یونیورسٹی کی تطہیر (Purging)۔

۳۔ کم از کم 30 سالوں کے لئے مخصوص اور خلاقانہ استعداد و صلاحیت موجہ (Innovative Ability & Capability Oriented) سد لیاقت (Efficiency Bar-E.B.) کا نفاذ۔

۴۔ معیار مطلوب استعداد اور صلاحیتوں کے فقدان کی بنیاد پر — جن کے جانچنے کا پیمانہ اساتذہ کی گزشتہ دس سے بیس یا تیس سالوں کی کارکردگی ہو — ان کی موجودہ اور آئندہ حیثیت کا تعین۔ از سر نو حیثیت کے اس تعین کے تحت متعدد تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں مثلاً:

۱۔ E.B. کے تحت ترقی کا انجماد۔

۲۔ بونس (Bonus)، الاونسز (Allownces) اور پرکس (Perks) میں انجماد۔

۳۔ اساتذہ کی باضابطہ تنزلی (Demotion) مثلاً ان کی پوسٹ گریجویٹ سے کالجوں یا سکینڈری اسکولوں حتی کہ مڈل اور پرائمری اسکولوں میں منتقلی۔ ابتدائی مرحلے میں اسے باضابطہ مہم (Drive) کی صورت میں کم از کم دو سالوں تک روبہ عمل لایا جائے۔

۴۔ یونیورسٹی میں لیکچرر کے ریڈر اور ریڈر کے پروفیسر ہونے کے لئے استعداد (Ability) اور

خلاقیت (Innovation) کو بنیاد بنایا جائے۔

۵۔ استعداد (Ability) اور خلاقیت (Innovation) کے دو پیمانے مقرر کر کے ایک تعبیری (Virtual) دوایوانی نظم (Bi-Cameral Setup) قائم کیا جائے جس کے دو ایوان ہوں:

ا۔ تدریسی اساتذہ جن کی استعداد اور خلاقیت کے جداگانہ معیار مقرر ہوں۔

۲۔ تحقیقی اساتذہ جن کی استعداد اور خلاقیت کے تدریسی اساتذہ سے جداگانہ معیار مقرر ہوں۔

۵۔ اگر صورت حال نا قابل کنٹرول اور نا قابل اصلاح نظر آئے تو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اصل دستوری حیثیت سے تعرض کئے بغیر انتظامی تدابیر (Executive Measures) اور حکم نامے کے ذریعہ یونیورسٹی کے بالخصوص مسلمان اساتذہ کے اقلیتی حقوق زیادہ سے زیادہ 30 سالوں کے لئے منجمد کر دیئے جائیں۔

'اقلیتی حقوق کے انجماد' کو درج ذیل صورتوں سے روبہ عمل لایا جا سکتا ہے:

ا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں عبوری انتظامی تدابیر کے ذریعہ باضابطہ حکم نامے سے جس کا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے دستور سے تعارض اور تصادم نہ ہو اس تدبیر کا صرف یک مرحلہ نفاذ کیا جائے کہ اگلے 30 سالوں تک کسی شعبے میں کوئی مسلمان پروفیسر مقرر نہیں کیا جا سکتا اِلا یہ کہ اس کی استعداد اور خلاقیت غیر معمولی ہو۔ اس مدت میں مرکزی یونیورسٹیوں سے کسی غیر مسلم استاذ کی جو پروفیسر ہو وہاں منتقلی اور تقرری کی جائے۔

۲۔ اسی طرح مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں کم از کم بیس سالوں تک اس حکم کا نفاذ کیا جائے کہ پوسٹ گریجویشن، ایم فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے Examiners اور Viva کے ممتحن کسی مرکزی یونیورسٹی کے پروفیسرز ہوں اور لازماً مسلمان نہ ہوں۔

۶۔ ظاہر ہے ایسی تدبیریں بادی النظر میں نازیبا، ناپسندیدہ اور تفریقی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی معقولیت (Rationality) اور مناسبت (Appropriateness) کے دو اسباب ہیں:

ا۔ مسلم معاشرے (Muslim Society)، مسلم قیادت (Muslim Leadership)، مسلم اداروں (Muslim Institutions) اور مسلم کارکردگی (Muslim Performance) میں صالح عناصر کی بے بسی اور غیر صالح عناصر (Rogue Elements) کے تغلب کا نا قابل تبدیل ہو جانا۔

۲۔ صدیوں سے چلی آ رہی مخصوص معاشرتی صورتحال کے سبب مسلم نفسیات (Psyche)، طبع

(Typicality) اور عادۃ (Habits) میں ناکارکردگی کا استحکام۔

اگر صرف گزشتہ ساٹھ سالوں کا دقیق جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ مذکورہ دو اسباب سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نیچے سے اوپر تک ٹیچر سے کورٹ تک درجہ بدرجہ اور بالا کثر صرف اس عنوان کے تحت کہ وہ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں بے استعداد لوگوں کا مامن (Safe Haven) اور غیر صالح عناصر کے اڈہ (Den) بن کررہ گئی ہے۔

عاجز کو پوری امید ہے کہ ان انتظامی تدابیر (Executive Measures) سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی حیویت (Vitality) یقینی طور پر بحال اور مستحکم ہو جائے گی۔

۷۔ یہاں چند امور کی وضاحت برمحل اور ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ سدِّ سبیل (Restrictions)، تطہیر (Purging) اور سدِّ لیاقت (Efficiency Bar) جیسی مجوزہ تدبیریں تفریقی (Discriminatory) ہیں نہ فرقہ وارانہ (Communal) اور نہ ہی معاندانہ (Hostile)۔ یہ بات پوری طرح واضح رہنی چاہیئے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور ایسا قطعاً ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ تجویز کی ان صورتوں کی روح اور غایت ریاست (State)، حکومت (Government) اور عمال (Administration) اور خود مسلمانوں پر واضح ہونی چاہیئے کہ یہ ساری مجوزہ انتظامی تدابیر کلیۃً طبی (Clinical)، جراحانہ (Surgical) اور سب سے اہم یہ کہ عبوری (Provisional) ہیں۔

۲۔ ان تدابیر کی تجویز کے پیچھے عمیق مطالعے، مشاہدے اور تجربے کو دخل ہے۔ چنانچہ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران برصغیر اور برصغیر سے ماوراء مقامی سے عالمی سطح تک مسلمانوں کی کارکردگی (Performance)— سعت (Extent) کی ہر تین سطحوں — یعنی Micro، Meta اور Macro کے ساتھ ساتھ مواد (Content) کی ہر تین سطحوں — یعنی تفکیری (Ideological)، تدبیری (Strategic & Tactical) اور تعملی (Executive) پر درج ذیل دو صورتوں میں ظاہر ہوئی ہے:

۱۔ غیر معمولی اور اعلیٰ ترین کارکردگی — اور

۲۔ ناگفتہ بہ اور بدترین کارکردگی۔

۸۔ مذکورہ دونوں قسموں کی کارکردگیوں کے سینکڑوں واقعات کا دقیق تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ان دونوں صورتحال میں چند استثنا کے سوا دو باتیں نمایاں رہی ہیں:

۱۔ جب بھی مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ماتحت کاموں کو انجام دیا جن میں کاموں کے کروانے کے محرکات، کروانے والوں کے حق میں جاتی تھیں تو مسلمانوں کی اوسط کارکردگی کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کی رہی۔

۲۔ اس کے برخلاف جب بھی مسلمانوں نے Exclusively اور Insular ہو کر ان کاموں کو انجام دیا ہے جن کے محرکات خود اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید تھے تو مسلمانوں کی کارکردگی کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے ناگفتہ بہ اور بدترین رہی۔

۹۔ ان دونوں احوال اور نتائج کا دقیق مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ مسلمانوں کی نفسیات (Psyche)، طبع (Typicality) اور عادۃ (Habits) میں وہ بدترین ذہنیت پیدا ہو کر راسخ ہو چکی ہے جسے 'بندگی' یا 'عبودیت' کہا جاتا ہے۔ روئے ارض پر انسانی معاشرت میں اور بالخصوص اجتماعیت کی سطح پر پیدا ہونے والی یہ بدترین اور کریہہ ترین بیماری ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو بنی اسرائیل میں مصر میں ظہور پذیر ہوگئی تھی جس کا ذکر سورہ الشعراء (26:22) میں کیا گیا ہے۔ یہ وہ بدترین اجتماعی ذہنی بیماری ہے جو کسی قوم کے ذہن اور جسم کو سڑا کر رکھ دیتی ہے۔ ایسی بیماری بڑی سے بڑی قربانیوں اور عظیم الشان تفکیر اور تدبیری کوششوں کے بعد بھی صدیوں سے پہلے ختم نہیں ہوتی یا شاید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی اسی بدترین ذہنی بیماری نے حضرت موسیٰ کی ساری خیر خواہیوں، قربانیوں، عزیمتوں اور کوششوں کے باوجود انھیں ناکامی سے دوچار کر کے چھوڑا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ بالآخر بنی اسرائیل کی اسی ذہنیت نے حضرت موسیٰ اور ان کے دست راست حضرت ہارون کو خود بنی اسرائیل کے ہاتھوں شہید کروا کر چھوڑا۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی حفاظت فرمائی۔

''بندگی' یا ''عبودیت'' کی یہ ذہنیت عجب اور جاں سوز نتائج برآمد کرتی ہے۔ اس بیماری میں مبتلا قوم دوسروں کے حق کہ اپنے معاند حکمرانوں کے ماتحت ان حکمرانوں کے سراسر مفادات کی تکمیل بھی اتنی جانفشانی، دیانت داری، مہارت اور حسن کارکردگی کے ساتھ کرتی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اکثر ایسی حالت میں ان کی کارکردگی اور ان کی بارآوری (Productivity) کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے غیر معمولی ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف یہی قوم نسبتاً زیادہ موافق حالات اور کئی گنا زیادہ وسائل مہیا ہونے کے باوجود

جب Exclusive اور Insular ہوکر خود اپنے مفادات کے لئے کام کرتی ہے تو اس میں ایسا فساد ذاتی اور ایسی سستی، بددیانتی، بدسلیقگی اور ناکارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اکثر ایسی حالت میں اس کی کارکردگی اور اس کی بارآوری (Productivity) کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے ناگفتہ بہ اور بدترین ہوجاتی ہیں۔

۱۰۔ جس طرح یہودی قوم کے نشوونما میں 'علمائے یہود' نے زور لگایا چنانچہ اس قوم کے ذہن اور فکر پر انہیں علمائے یہود کا غلبہ ہے ٹھیک اسی طرح مسلم قوم کے نشوونما میں 'مسلم علما' نے زور صرف کیا اور اس قوم کی نفسیات صد فیصد 'علما' کے ذہن و فکر کا Alter Ego بن گئی۔ قرآن اور اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر مسلمانوں کے بیشتر علمی کام اور ان کا بیشتر ذخیرۂ علم 'علما' کی طبع کے عکاس ہیں۔ یہ ذخیرۂ علم کیا ہے؟ اور یہ علمی کام کیسا ہے؟

لفاظیاں، مبالغہ آرائیاں، بے اعتدالیاں اور افسانہ طرازیاں! ان میں ہر ایک حقیقت کی دشمن۔ ایسا آخر کیوں کر ہوا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ کبھی تحقیق نہیں کی گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے: آخر کیوں؟ اس لئے کہ 661 عیسوی کے بعد امت مسلمہ کے لئے تحقیق کرنا حرام اور جرم قرار دے دیا گیا۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ 'علما' اور تحقیق ایک دوسرے کی ضد تھے۔ تحقیق ہوتی تو 'علما' فنا ہو جاتے۔ 'علما' کی بقا کے لئے تحقیق کا فنا کردیا جانا ناگزیر قرار پایا۔

عصر حاضر میں 'علمائے اسلام' کی نفسیات کیا ہے اور اس کی جامع اور اکمل شکل کہاں دیکھی جاسکتی ہے؟ عصر حاضر میں 'علما' کی نفسیات آٹھ عناصر پر مشتمل ہے۔ یہ آٹھ عناصر ہیں:

۱۔ Sentimentalism

۲۔ Epicureanism

۳۔ Romanticism

۴۔ Nostalgia

۵۔ Megalomania

۶۔ Insularity

۷۔ Exclusiveness — اور

۸۔ Inferiority Complex

یہ آٹھ عناصر 'علما' کی نفسیات کے اجتماعی عناصر ہیں لہذا کسی ایک ذات میں ان کا بتمام وکمال جمع ہونا یا پایا جانا نہایت دشوار ہے۔ تاہم گزشتہ دوسو سالوں میں دو ہستیاں ایسی ضرور نظر آتی ہیں جن کی ذات میں یہ تمام عناصر بتمام و کمال جلوہ گر نظر آتے ہیں جن کا ادراک کرنا تو آسان ہے لیکن جملہ عناصر کی جامعیت کا احاطہ کرنا از حد دشوار ہے۔ ان دو ہستیوں میں پہلی جامع اور کامل ہستی شیخ محمد عبدہ کی ہے اور دوسری جامع اور کامل ہستی مولانا شبلی نعمانی کی ۔ شیخ محمد عبدہ اور مولانا شبلی کی جملہ تصنیفات (کتابیں، مضامین، خطبات اور مکتوبات) اس کی شاہکار ہیں۔ 'علما' کی یہ طبع امت میں از حد مقبول ہے۔

۱۱۔ چنانچہ ہندوستان کے طول وعرض میں اور ہندوستان سے باہر بالخصوص مغربی ملکوں میں اگر زندگی کے جملہ میدانوں میں مثلاً — تعلیم ، تدریس، تحقیق ،تصنیف ،حکمرانی، سفارت کاری، تالیف و ترتیب، ترجمہ، ترجمانی، صحافت، اداکاری، ادب، سائنس، ٹکنالوجی، لسانیات، عمرانیات، اسپورٹس، اتھیلیٹکس وغیرہ اور ان کی ہر چار سطحوں یعنی بین الاقوامی (International)، سرکاری (Governmental)، نیم سرکاری (Semi-Governmental) اور غیر سرکاری (Non-Governmental) اور ان کی ہر تین انواع — یعنی تفکیری (Ideological)، تدبیری (Strategic) اور تعمیلی (Executive) میں مسلمانوں کی موجودہ کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اول الذکر صورت میں یعنی غیر مسلموں کے ماتحت ان کے مفادات کی تکمیل میں ان کی کارکردگی غیر معمولی اعتبار سے اعلیٰ ترین حتی کہ مثالی ہو جاتی ہے۔

۱۲۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ٹھیک اسی وقت بلکہ کبھی کبھی تو ایسا دیکھا گیا ہے کہ وہی لوگ جنھوں نے غیروں کے ماتحت مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے — اس کے برخلاف ہندوستان ہو یا ہندوستان سے باہر بالخصوص مغربی ملکوں میں زندگی کے ان میدانوں میں جن میں اسلام یا مسلمانوں کے مفادات وابستہ ہیں ان کی کارکردگی ہر تین سطحوں اور ہر تین انواع میں ناگفتہ بہ اور بدترین ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں محض یہ فرق ہوتا ہے کہ ناگفتہ بہ اور بدترین کارکردگی کا مظاہرہ صرف اور صرف وہاں ہوتا ہے جہاں مسلمان Exclusive اور Insular ہو کر کام کرتا ہے۔

یوں تو اس حوالے سے انفرادی، ادارہ جاتی اور سرکاری ہر تین سطحوں پر بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن عاجز صرف چار مثالوں پر اکتفا کرے گا:

ا۔ فورٹ ولیم کالج (1700) اور ایشیاٹک سوسائٹی (1784) میں شامل مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

۲۔ انگریزوں کے ماتحت دلی کالج اور نکولا مسابکی کے ماتحت مطبعہ بولاق مصر (1821) میں شامل مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

۳۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد میں مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

۴۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں شامل مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

ان میں اول الذکر دو زمرے اپنے حسن کارکردگی کے لئے اور آخر الذکر دو اپنی بدترین کارکردگی کے لئے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں اول الذکر دو زمرے زندگی کے ہر میدان میں انقلاب لانے کے لئے اور موخر الذکر دو برپا انقلاب کو موت کی نیند سلا دینے کے لئے یاد رہیں گے۔ جہاں تک دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد کی بات ہے تو اس کے بارے میں ایک مشہور رائے یہ پائی اور پھیلائی جاتی رہی ہے کہ اس کا خاتمہ سلطنت آصفیہ کے خاتمے کے ساتھ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ دائرۃ المعارف عثمانیہ کا خاتمہ اس آشوب میں ہوا جب سلطنت آصفیہ کا ریاست ہند میں 1948 میں الحاق ہوا۔ یہ بات درست ہے لیکن صرف اس حد تک کہ دائرۃ المعارف عثمانیہ اپنے جسد کے اعتبار سے 1948 میں 'مردہ' قرار پایا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ دائرۃ المعارف عثمانیہ کے قیام، کارکردگی اور تاریخ کا دقیق مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس کی حقیقی اور روحانی موت تو اسی وقت واقع ہو چکی تھی جب علامہ شبلی، مولانا فراہی اور دیگر علما اور اہل علم اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ ہو گئے۔ یہ موت فی الحقیقت دائرۃ المعارف عثمانیہ کے عرصۂ حمل (Prenatal Period) میں ہی واقع ہو چکی تھی۔ دائرۃ المعارف ایک 'مردہ جسد' (Still Born) تھا۔ جہاں تک اس 'جسد' کی بات ہے تو وہ اب بھی حیدرآباد میں بعض کی نظر میں زندہ اور بعض کے مطابق نعش گاہ میں پڑا ہے۔ یہ ادارہ قطعاً وہ نہیں جس کا خاکہ سر سالار جنگ اور سید حسین بلگرامی نے سوچا تھا۔ 'علما' کی شمولیت نے اس ادارے میں Exclusiveness اور Insularity پیدا کر کے اسے بے روح کر دیا۔ لیکن جس ناکارکردگی کا بطور خاص ذکر کیا جانا چاہیئے وہ شعبۂ دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور اس کا شہرۂ آفاق کارنامہ اب تک طبع شدہ ''دائرۃ المعارف الاسلامیہ'' کی بیس سے زاید جلدیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ امت مسلمہ میں مسلمانوں کے ذریعہ بیسویں صدی میں انجام دیا جانے والا یہ سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں مسلم اہل علم کے ذریعہ انجام دیا جانے والا یہ وہ بدترین 'کام' ہے جس کے عواقب اور برے نتائج آئندہ سو سالوں تک اتنے بھیانک اور

ھولناک ہوں گے جن کا اندازہ کم ہی لوگوں کو ہوگا۔ اس 'عظیم الشان' کام کی کم از کم دو خرابیاں کسی مہلکہ سے کم نہیں۔ یہ دو خرابیاں درج ذیل ہیں:

ا۔ یہ مبسوط 'گمراہ کن' ہے اس لئے کہ یہ حد درجہ Exclusive اور Insular ہے۔

۲۔ اس کے حقائق (Facts)، مواد (Data) اور تعبیرات (Nuances) تحقیق، تقاضۂ تحقیق، ضرورتِ تحقیق اور عصمت تحقیق کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس سے استفادہ کرنے والے کے اندر رجحان تحقیق کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ مبسوط 'طبع' کے لحاظ سے تحقیق مخالف (Anti-Research) ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کا مواد اول وہلہ میں 'سوال' کو ہلاک کر دیتا ہے۔ عاجز کو اندیشہ ہے کہ کم از کم اردو۔نہاد اہل علم کی آئندہ تین نسلیں اس کے زیر اثر علمی اور فکری اعتبار سے تباہ ہو کر رہ جائیں گی۔ اکیسویں صدی کی ابتدا میں نظام عالم میں واقع ہونے والے تداول قوت (Power Shift) اور اس کے زیر اثر اذہان وعلوم میں واقع ہونے والے Change of Scale نے اسے اور بھی بھیانک بنا دیا ہے۔ اگر اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کا یہی تصنیفی کام مثلاً ہالینڈ، بلجیم یا جرمنی میں غیر مسلم ذمہ داروں کے زیر نگرانی انجام پاتا بایں صورت کہ پنجاب یونیورسٹی کا سارا عملہ وہی کا وہی رہتا تو اس کی افادیت، کیفیت اور عینیت (Factuality) ہر اعتبار سے کم از کم دس گنا بڑھ جاتی۔

تنقیح اور توضیح

۱۔ مذکورہ دونوں تجویزوں کے تعلق سے اب صرف ایک بات زیر بحث آنا رہ جاتی ہے۔ کسی بھی تجویز کی پیش کش میں یہ بات دیکھنی نہایت ضروری ہے جس کے لئے پوری دقتِ نظر، تفصیل اور متعدد جہتوں سے بھر پور جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ آیا وہ تجویز قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں؟ یہی سوال مذکورہ دونوں تجویزوں کے تعلق سے بھی پیدا ہوتا ہے: ان تجویزوں کی قابلیتِ عمل (Feasibility) کیا ہے؟

۲۔ تجویز اول کی قابلیتِ عمل (Feasibility):

اس حوالے سے دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا تجویز اول یعنی 'سرسید تحریک کا جامع یا مکمل احیا' یا 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کی تشکیل کی تجویز اور اس کا مذکورہ طریقۂ کار (Methodology) قابلِ عمل (Feasible) ہے؟

۲۔ کیا یہ تجویز 'موجودہ صورتحال میں' قابلِ عمل ہے؟

بحیثیت مجوز عاجز کو اس بات میں زرا بھی شبہہ نہیں کہ:

'موجودہ صورتِ حال میں' (Ceteris Paribus) یہ تجویز موجودہ صورت میں ناممکن العمل (Unfeasible) ہے۔

اب باقی رہ جاتا ہے سوال اول — تو عاجز کی رائے ہے کہ بایں ہمہ یہ تجویز 'Mediate' اور 'Immediate' ہر دو صورتوں میں قابلیتِ عمل (Feasibility) رکھتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دراں صورت اس تجویز پر کیوں کر عمل درآمد ہو؟ لیکن عاجز کے خیال

میں اس بات پر غور کرنے سے قبل یہ جاننا از حد ضروری ہے کہ 'موجودہ صورتحال میں' (Ceteris Paribus)اس کے ناقابلِ عمل ہونے کی اصل حقیقت ہے کیا؟

'موجودہ صورتحال میں' اس کے قابلِ عمل ہونے میں تین رکاوٹیں (Constraints) درپیش ہیں:

۱۔افرادِکار کی رکاوٹ (Work-Force Constraint)

۲۔وسائل کی رکاوٹ (Resource Constraint)

۳۔میقات کی رکاوٹ (Gestational Constraint)

ظاہر ہے یہ تینوں رکاوٹیں 'موجودہ صورتحال میں' اور فی الفور ناقابلِ ازالہ ہیں۔اس صورتِ حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے؟ چنانچہ پھر دو ہی راہیں بچ رہتی ہیں:

۱۔کچھ نہ کیا جائے!

۲۔کچھ بھی کیا جائے!

اب اگر مسئلہ وجود (Existence) یا بقا (Survival) کا ہو تو پہلی راہ بادی النظر (Prima Facie) میں قابلِ رد ہو جاتی ہے۔ظاہر ہے صرف دوسری راہ بچ رہتی ہے۔لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری راہ کے اختیار کرنے کی معقولیت (Rationality) اور جواز (Justification) کیا ہو؟

چنانچہ مجوز کے نزدیک اس کی معقولیت (Rationality) اور اس کا جواز (Justification) یہ ہے کہ ہم انہیں 'Mediate' یا 'Immediate' ہدف کے بطور یا کم از کم تجویزِ اول کے مقصدِ اصل کے ہدف کی تکمیل کے لئے موافق فضابندی کے حصول کے لئے بطور 'Tool' اختیار کر سکتے ہیں۔

امت مسلمہ جس سے انسانیت کی آئندہ امیدیں اور فلاح وابستہ ہیں جن احوال میں گرفتار ہے اور اسے آئندہ جن چیلنجوں کا سامنا ہے اس میں انسانیت کی بھلائی کو یقینی بنانے کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس Exclusiveness اور Insularity سے نکلنے کے لئے 'قیادت' سے مکمل طور پر پیچھا چھڑائے۔اس تجویز کے اختیار کرنے سے دو اہداف میں سے دونوں یا کم از کم ایک ہدف تک رسائی لازماً ممکن ہو جائے گی:

۱۔ اس Exclusive اور Insular قیادت سے حقیقی انقطاع (Actual Disengagement)۔

۲۔اس Exclusive اور Insular قیادت سے ماحولی انقطاع (Atmospheric Disengagement)۔

۳۔ تجویز دوم کی قابلیتِ عمل (Feasibility):

اس تجویز کے حوالے سے بھی سب سے بڑا سوال اس کی قابلیتِ عمل (Feasibility) ہے۔

عاجز کی رائے ہے کہ اس تجویز کا قابلِ عمل ہونا خواہ درجۂ اول پر ممکن نہ ہو لیکن درجۂ دوم اور درجۂ سوم پر بلاشبہ ممکن ہے۔ اس تعلق سے صرف ایک بات قابلِ تشویش اور قابلِ غور ہے:

عاجز کو اس بات میں قطعاً شبہ نہیں کہ اگر اس تجویز پر عمل درآمد کیا گیا تو امت پر اس کے نہایت تکلیف دہ ذیلی تاثیرات (Side-Effects) لازماً مرتب ہوں گے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی حالت میں امت ایسی تجویز پر عمل کرے؟

جیسا کہ عاجز عرض کر چکا ہے کہ جب مسئلہ وجود (Existence) اور بقا (Survival) کا درپیش ہو تو ایسی کسی ذیلی تاثیر (Side-Effects) کو گوارا کرنے کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ مسئلۂ وجود و بقا اسے اختیاری (Optional) رہنے ہی نہیں دیتا۔ لیکن جیسا کہ عاجز نے عرض کیا کہ مسلمانوں کے پاس ان کے Exclusive اور Insular قیادت سے پیچھا چھڑانے کی یہ واحد صورت باقی رہ گئی ہے لہٰذا ان کے لئے ان تمام ذیلی تاثیرات (Side-Effects) کو طوعاً جذب کر لینا اس سے بہتر ہوگا کہ جب یہ قیادت حسبِ روایت مصیبت میں قوم کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور قوم اسے کرہاً جذب کرے۔

لہٰذا عاجز کے نزدیک ان ذیلی تاثیرات کو رضاکارانہ جذب کر لینا حرکتِ مذبوحی سے بدرجہا بہتر ہے۔

۴۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے: کیا ان تجویزوں پر عمل درآمد سے امتِ مسلمہ فی الواقع اپنی Exclusive اور Insular قیادت سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائے گی؟

عاجز کی رائے ہے کہ 'موجودہ صورتحال میں' (Ceteris Paribus) ایسا ہونا یقینی نہیں۔ اس کے کئی وجوہ ہیں:

ا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے اس Exclusive اور Insular قیادت کا انقطاع لازماً انھیں پوری قوم میں بے اثر (Neutralize) نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ بات بھی ذہنوں میں واضح رہنی چاہئے کہ مسلمانوں کی Exclusive اور Insular قیادت کا اصل کشت زار (Nursery) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ذہنوں میں واضح رہنی چاہیۓ کہ مسلمانوں کی مرئی Exclusive اور Insular قیادت ان کی اصل قیادت نہیں ہے۔ ان کی اصل قیادت تو وہ تعبیری (Virtual) اور غیر مرئی

(Invisible) قیادت ہے جس کی غذا امت کے جسم میں پائی جانے والی حرارتِ غریزی ہے۔ مسلمانوں کی Exclusive اور Insular قیادت اس اصلی قیادت کی محض ظل (Shadow) ہے۔

661 عیسوی کے بعد امت مسلمہ کی اصلی قیادت 'علما' کی قیادت ہے جس کا اصل کشت زار مسلم معاشرہ ہے۔ یہ کشت زار اس 'قیادت' کا Most Favourable Breeding Ground and Habitat ہے۔ مسلم معاشرہ اس قیادت کے لئے نہ صرف کشت زار ہے بلکہ Multiplier بھی ہے۔

اس صورتحال میں 'مخمصۂ مہدی' کا سب سے بڑا ہدف یہی قرار دیا جاسکتا ہے کہ امتِ مسلمہ کا حقیقی اور براہ راست (Direct) تعلق نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بحال (Restore) کیا جائے تاکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر 'اسلام اجنبیوں کے مانند پھر پلٹے گا جیسے پہلے آیا تھا' (سیعود کما بداء: ترمذی) عالم واقعہ میں حقیقت کا جامہ پہن سکے۔

عاجز کے نزدیک 'مخمصۂ مہدی' کے خارزار سے انسانیت کو کامیابی سے گزار لے جانے کی بہترین صورت ان دو تجویزوں پر عمل درآمد ہے۔

۵۔ ہندوستان ایک دستوری، جمہوری، وفاقی اور فلاحی ریاست (Constitutional, Demoratic, Federal & Welfare State) ہے لہٰذا عوام کے ہمہ گیر فلاح کو یقینی بنانا اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

فلاحی ریاست (Welfare-State) کے فرض منصبی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے عوام یا شہریوں (Citizen) کو انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے 'فلاحی شہری' بنائے۔ 'فلاحی شہری' بنانے سے مراد بحیثیت شہری ہر فرد اور اس کے مجموعہ سے بننے والی ہر اجتماعیت کے اندر کم سے کم اتنی استعداد (Minimum Ability) پیدا کرے تاکہ وہ اپنے شہری حقوق اور شہری ذمہ داریوں کے تقاضوں کو Optimally پورا کرسکیں۔ چنانچہ ہر فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہر شہری کو اس استعداد کے حصول کا پابند بنائے اور اس کی سہولیات مہیا کرے۔ اسی ذمہ داری کی ادائیگی قومی کامن بیس (National Common Base) کے تحت وضع کردہ تعلیمی نظام اور اس کے نصاب کے نفاذ اور ہر شہری کو اسے مہیا کرانے سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی فلاحی ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اس قومی کامن بیس (NCB) سے استفادہ کو یقینی بنائے۔ اس حوالے سے اولین ذمہ داری خود مسلمانوں بالخصوص عام مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انہیں [illegible] قومی کامن بیس (NCB) کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس

ہدف کو پیش نظر رکھ کر درج ذیل تجویزیں پیش کی جاسکتی ہیں:

۱۔ ملک میں Across the Board پرائمری، مڈل اور سکنڈری تعلیم کا قومی کامن بیس (National Common Base) بنایا جائے اور مسلمانوں کی تعلیم کو بلا استثنا اس کا حصہ بنادیا جائے۔

۲۔ تعلیم کا یہ قومی کامن بیس (National Common Base) سب کے لئے لازمی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ملک کے ہر شہری پر اس کا حامل ہونا لازمی ہو۔ ملک میں اس قومی کامن بیس سے گزرے بغیر کوئی تعلیمی استعداد قابلِ تسلیم نہ ہو۔

۳۔ حکومت مسلمانوں کے 'مدارس' کے ذمہ داران سے دریافت کرے کہ وہ واضح کریں کہ ان کا 'مدرسہ جاتی نظام تعلیم' جامع (Comprehensive) نظام ہے یا خصوصی/تخصصی (Specialized)۔ کیا مدرسہ جاتی نظام مسلم 'افراد' اور مسلم معاشرے کی جملہ ضروریات کی تکمیل کرتا ہے یعنی 'مہد سے لحد' تک کی انفرادی اور اجتماعی جملہ تعلیمی، تدریسی، تحقیقی، تربیتی، علمی اور تجرباتی مطالبات پوری کرتا ہے یا مخصوص؟ اگر ان کا موقف یہ ہو کہ یہ مدرسہ جاتی نظام تعلیم جامع (Comprehensive) نہیں بلکہ تخصصی (Specialized) نظام ہے تو پھر ان سے کہا جائے کہ وہ ملک میں رائج اور مجاز تمام خصوصی تعلیم (Specialized Knowledge) کے اداروں مثلاً Engineering Colleges, Medical Colleges کی طرح صرف Graduate اور Post-Graduate سطح پر اس تعلیمی نظام کو چلائیں جہاں صرف انھیں طلبہ کا داخلہ ممکن ہو جو دو تقاضے پورے کرتے ہوں:

۱۔ وہ سکنڈری سطح تک ملک میں رائج قومی کامن بیس کی تعلیمی استعداد اور سند رکھتے ہوں۔

۲۔ مدارس کی تخصصی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔

علی گڑھ ایک شہر ہے اور نہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ محض ایک یونیورسٹی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 'انسانیت' کی آخری امید ہے۔ یہاں 'انسانیت' مستقبل میں اپنی بقا کی آخری اور فیصلہ کن لڑائی لڑ رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی بقا پر مستقبل میں انسانیت کی بقا منحصر ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اب انسانیت کی بقا اور موت کی علامت بن چکی ہے۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی بقا سرسید کی بصیرت کی بقا میں مضمر ہے۔ سرسید کی بصیرت پر عمل آوری بے بصیرتی اور ظلم کے خلاف انسانیت کی بقا کی سب سے موثر تدبیر ہے اور 'قرآنی انسان' کی بازیافت کی سب سے احسن صورت۔